ہمدرد
نونہال



کارمینا

"کارمینا" کی ہاضم اور مزے دار ٹکیاں بچوں کے ہضم کو ہمیشہ صحیح رکھتی ہیں۔
بچے کھانا کچھ ہی کھائیں کھانے کے بعد "کارمینا" کی ایک مزے دار ٹکیہ اکسیر کا
حکم رکھتی ہے۔ انکو بدہضمی ہوگی نہ دست آئینگے اور نہ ہی شول یا درد شکم کی
کوئی اور تکلیف ہوگی۔ انکے اعضائے ہضم ٹھیک کام کریں گے۔
اور وہ ہمیشہ چست اور تندرست رہیں گے۔



ہمدرد

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

مشرقی پاکستان:۔ ڈھاکہ ۔ چٹاگانگ ۔ مغربی پاکستان:۔ کراچی ۔ لاہور۔

اپریل ۱۹۶۵ء

مدیر اعلا: حکیم محمد سعید

مدیر معاون: مسعود احمد برکاتی

فون: ۴۷۷۷۵

شمارہ ۴ جلد ۱۲

دفتر ہمدرد نونہال
ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۱۸

ہمدرد نونہال

جاگو، جگاؤ

اچھا عمل خود اس کو انجام دینے والے کے لیے بھی اچھا ہوتا ہے، اور دوسروں کے لیے بھلائی کا سبب بنتا ہے، کیوں کہ وہ بھی اس کو دیکھ کر ویسا ہی عمل کرتے ہیں۔ جس طرح برف خود بھی ٹھنڈا ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ اسی طرح اچھا عمل ہے۔

اچھے کام کرو اور دوسروں کے اچھے کاموں کی تقلید کرو!

حکیم محمد سعید



قیمت:- ایک رسالہ: ۷۵ پیسے — سالانہ: آٹھ روپے



محشر بدایونی

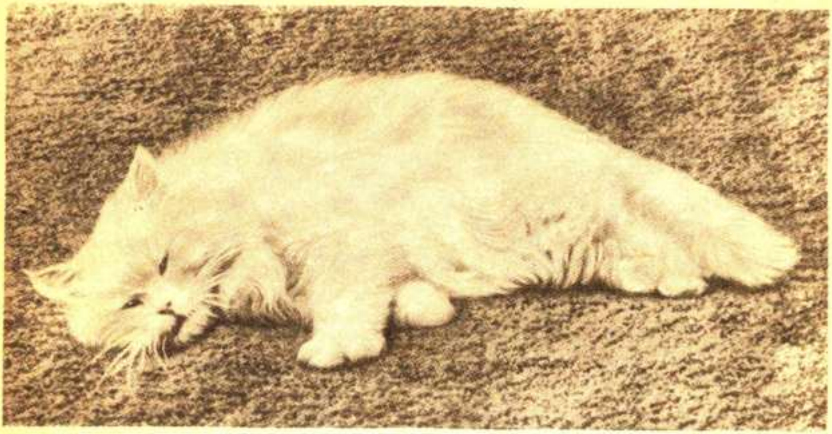
ٹیلیفون

میرے ابّا کا ہے دفتر   وہ ہیں اِس دفتر کے افسر
ٹیلیفون لگا ہے گھر میں   ایک ہے ابّا کے دفتر میں
جب بھی میرے جی میں آیا   ٹیلیفون وہیں کھڑکایا
امّی نے جب مجھ کو مارا   اور مَیں نے ابّا کو پُکارا
اُنگلی سے "ڈائل" کو گھمایا   ابّا کے نمبر کو مِلایا
گنتی بھی رہ رہ کے سُنائی   "ہلّو ہلّو" آواز آئی
شکوے تھے جو دل میں ہمارے   کہہ ڈالے ابّا سے سارے
دن ہو یا طوفانی راتیں   گھر بیٹھے لوگوں سے باتیں

ٹیلیفون بڑی نعمت ہے!
اِس سے گھر بھر کی راحت ہے



SAMI.65



بلّی کی کہانی، اُس کی اپنی زبانی

صوفی تبسّم

ہے تو بڑی گستاخی، لیکن میں پہلے ہی ایک بات کہہ دینا چاہتی ہوں. میں اُن انسانوں کی طرح نہیں ہوں، جو اپنا تعارف کراتے وقت اپنی خوبیاں تو بیان کر دیتے ہیں، لیکن اپنی برائیاں چھپا لیتے ہیں، تاکہ لوگ سن کر کہیں سُبحان اللہ ! ماشاء اللہ ! کیا کہنے ! میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں اپنے بارے میں اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں کہوں گی، آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیا ہیں۔

تو سنیے پہلے میں اپنی برائیاں ہی بیان کرتی ہوں اور پھر خوبیاں بتاؤں گی اور آپ خود ہی فیصلہ کرسکیں گے کہ ہم کیا ہیں؟ حیوانوں کا علم جاننے والوں کا خیال ہے کہ کوئی چھے ہزار سال پہلے ہماری نسل آپ لوگوں کے بزرگوں کے ساتھ رہتی سہتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کسی وقت اپنے بڑوں سے یہ نہیں سنا کہ بلّی کس زمانے میں آدمی سے مانوس ہوئی اور اس کے ساتھ گھر میں رہنے لگی۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ جنگلی بلیاں ہم شہری بلّیوں سے قدوقامت میں زیادہ بڑی ہوتی ہیں اور زیادہ طاقتور ہوتی ہیں،

بلکہ وہ تو اتنی نڈر اور بے باک ہوتی ہیں کہ اپنے سے بڑے حیوان پر حملہ آور بھی ہوتی ہیں۔ اُن کی ایک اور خصوصیت بھی ہے اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ اُن کا رنگ عموماً خاکستری ہوتا ہے۔ اُن کی خاکستری پیٹھ پر سیاہ دھبے سے ہوتے ہیں۔ یہ وحشی بلّیاں جنگلوں میں رہتی ہیں، خاص کر پہاڑوں کی بلندیوں پر، جہاں پینے کے لیے پانی میسّر آسکتا ہو۔ غاروں میں یا درختوں کے کھوکھلے تنوں میں بسیرا کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے اپنے بزرگوں کے حالات کا پتا بھی نہیں۔ البتہ گھریلو بلّیوں کے بارے میں مجھے بہت کچھ معلوم ہے۔

آپ جانتے ہی ہیں کہ انسانوں کے درمیان رہ کر کچھ مدّت کے بعد ہم قدرے مہذّب ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ ہاتھی بھی جو سب جانوروں سے بڑا ہے اور شیر جو درندوں کا بادشاہ ہے، کچھ عرصے کی تربیت سے رام ہوجاتا ہے۔

لیکن بھیڑیا اتنا بد اصل اور شریر ہے کہ اُسے کتنا ہی سدھایا جائے، اُس کی خصلتیں بالکل نہیں بدلتیں اور اُس کی طبیعت کی بدی دُور نہیں ہوتی۔ آپ نے فارسی کا یہ شعر سنا ہوگا ؎

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود
گرچہ با آدمی بزرگ شود

(بھیڑیے کا بچّہ انسان کے ساتھ ہی پرورش پاکر بڑا کیوں نہ ہو، پھر بھی وہ بھیڑیا ہی رہتا ہے۔)

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہماری اپنی حالت بھی بھیڑیے سے کچھ بہتر نہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی کتنا ہی پیار کیوں نہ کرے، ہم اُس سے ہمیشہ کے لیے مانوس نہیں ہوتیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم بڑی احسان فراموش اور بے مروّت ہیں۔ اگر ظاہراً کسی سے کوئی دلی لگاؤ پیدا بھی کرتی ہیں تو اس میں کوئی اپنا فائدہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس بارے میں ہم جنگلی بلّیوں سے بھی گئی گزری ہیں۔ جنگلی بلّیاں ہماری نسبت زیادہ صبر اور حوصلے والی ہوتی ہیں۔ اگر اُنھیں شکار کے لیے ایک جگہ بیٹھ کر دس بارہ گھنٹے انتظار بھی کرنا پڑے تو بے چین نہیں ہوتیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ اگر ہمیں کوئی محبت سے گود میں لے کر بیٹھے اور پیار کرے تو ہم دو چار منٹ سے زیادہ اس پیار کی تاب نہیں لاسکتیں،

کود کر بھاگنے کی کوشش کرتی ہیں اور کوئی روکنا چاہے تو پنجے دکھاتی ہیں، جیسے ہم یہ کہہ رہی ہوں کہ چھوڑیے جناب، ہم باز آئے آپ کے پیار سے۔ اور کبھی کبھی اُسے زخمی بھی کردیتی ہیں۔

بلّیاں اور کتّے ایک ہی خاندان سے ہیں، لیکن کتّے بلّیوں سے اچھے ہوتے ہیں۔ وہ آسانی سے سُدھر جاتے ہیں۔ انسان سے مانُوس ہو جاتے ہیں۔ اس کے گھر کی پاسبانی کرتے ہیں۔ شکار کھیلتے ہیں۔ غرض بڑے فرماں بردار اور خدمت گزار ہوتے ہیں۔ ہم بلّیوں میں ایسی کوئی خوبی نہیں۔

آپ لوگوں میں ہمارے بارے میں بعض قصّے مشہور ہیں، مثلاً ایک قصّہ یہ ہے کہ ایک زاہد، پرہیزگار آدمی کی بلّی تھی۔ وہ شخص جب رات کو عبادت کے لیے اٹھتا تو بلّی چراغ ہاتھ میں لے کر چلتی۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ ایک پروفیسر نے بلّی پالی تھی۔ وہ رات کو جب تک کتاب پڑھتا رہتا، بلّی اس کے پاس بیٹھی رہتی۔ جب پروفیسر صاحب کی آنکھوں میں نیند آنے لگتی تو وہ بلّی اپنی دُم ہلا کر شمع کو بجھا دیتی۔

میں آپ لوگوں کو یقین دلاتی ہوں کہ یہ سب قصّے غلط ہیں۔ البتہ ہم میں ایک خوبی ہے اور وہ یہ کہ ہم بڑے آرام اور احتیاط سے چلتی ہیں اور چلنے میں آہٹ تک نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں کبھی نازک نازک چیزوں پر سے بھی گزرنا پڑے تو انھیں ذرا بھی ٹھیس نہیں لگتی۔

آپ نے ہماری لمبی لمبی مونچھیں دیکھی ہوں گی۔ ان مونچھوں کے بل پر ہم اونچی جگہ سے چھلانگ لگائیں تو ہمارا جسم سیدھا رہتا ہے اور ہم پاؤں کے بل زمین پر آ پڑتی ہیں۔ صرف ہماری مونچھیں ہی نہیں ہمارے بدن ہی میں ایسی لوچ اور نرمی ہے کہ ہمیں ان چھلانگوں سے چوٹ نہیں لگتی۔ ایسی خوبی کسی اور جانور میں آپ کو نظر نہیں آئے گی۔

ہم میں ایک اور خوبی بھی ہے، جو کتّے، چیتے، شیر یا گیدڑ میں نہیں پائی جاتی، اور وہ یہ ہے کہ ہم بدن کو بڑا صاف ستھرا رکھتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہم کس طرح ایک کونے میں بیٹھی اپنے بدن کو چاٹتی رہتی ہیں۔ اس طرح کرنے سے نہ صرف ہمارا بدن ہی صاف ہوتا ہے، بلکہ ہمارے جسم پر سورج کی روشنی سے جو وٹامن

جمع ہوجاتے ہیں، وہ بھی زبان کی چاٹ سے ہمارے بدن میں داخل ہوجاتے ہیں اور ہمیں طاقتور بناتے ہیں۔

ہم بلّیاں سال میں دو مرتبہ بچّے دیتی ہیں۔ جب بچّے پیدا ہوتے ہیں تو ہمیں پتا ہوتا ہے کہ کون سا بچّہ زندہ رہے گا اور کون سا مرجائے گا۔ پھر ہم مرنے والے بچّے کی زیادہ پروا نہیں کرتیں۔

ہم اپنے بچّوں کو تقریباً دو مہینے تک دودھ پلاتی رہتی ہیں اور ان کی بڑی نگرانی کرتی ہیں۔ اگر ہمیں کسی بلّے کے آنے کا پتا چل جائے، جو عام طور پر بچّوں کو کھا جاتا ہے تو ہم بچوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں، تاکہ وہ امن سے رہیں۔

میں کہیں بھول نہ جاؤں، ہمیں گوشت، دُودھ، پنیر، دہی، لسّی اور پلاؤ مرغوب ہیں۔ اس کے علاوہ ہم اور بھی بہت کچھ کھا جاتی ہیں، لیکن ہم پیٹو ہی نہیں۔ اگر کبھی بھوکا بھی رہنا پڑے تو بھوک کا مقابلہ کرلیتی ہیں۔ اگر آپ مجھے باتونی نہ کہیں تو ایک قصّہ سنادوں!

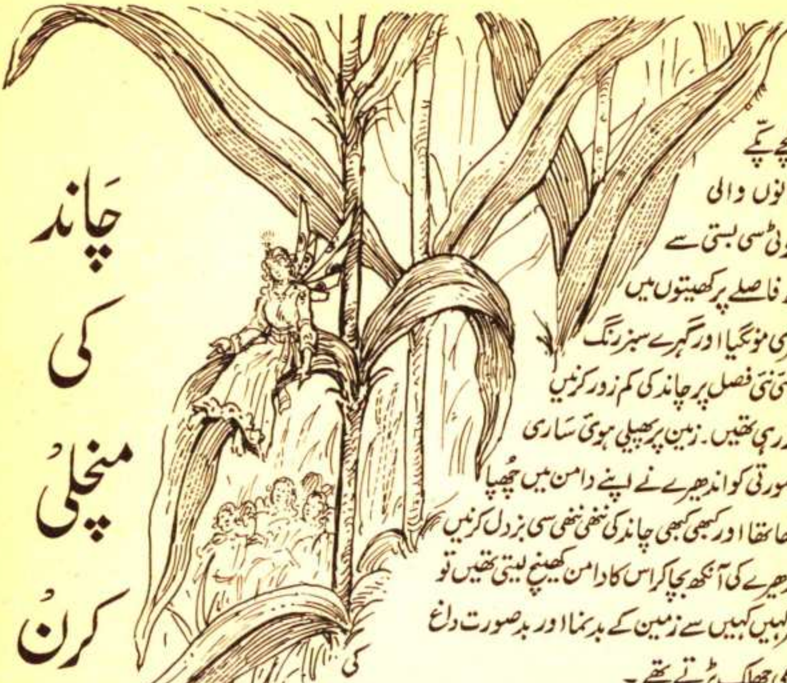
ایک مرتبہ ایک کارخانے میں ایک صندوق کے اندر ایک مشین پڑی تھی۔ صندوق کھلا تھا۔ ایک بلّی چپکے سے اس میں گھس گئی اور کسی نے خیال نہ کیا۔ کارخانے والے نے صندوق بند کردیا اور اُسے کسی دوسرے شہر روانہ کردیا۔ وہاں پہنچنے میں تقریباً ایک مہینہ گزر گیا۔ معلوم ہے کیا ہوا؟ بلّی صحیح و سالم وہاں پہنچ گئی۔ البتہ وہ ذرا کمزور ہوگئی۔ کھانے کو صندوق میں تھا تو کچھ نہیں، وہ مشین کے پرزوں سے تیل کی لیس ہی چاٹ کر گزارہ کرتی رہی۔

اب ذرا میری دو ایک نصیحتیں بھی سن لیجیے۔ آپ ہمیں ایسی جگہ نہ سونے دیں، جہاں آپ کے بھائی بہن سوتے ہوں، کیوں کہ ہمارا سانس نقصان دہ ہوتا ہے اور ہمارے پنجوں میں بعض اوقات جراثیم چمٹے ہوتے ہیں، جو آپ کی صحت کے لیے مضر ہیں۔ اس کے برعکس ایک بات ضرور کیجیے۔ ہمیں آپ نے نیند سے بیدار ہوتے دیکھا ہوگا۔ ہم جب جاگتی ہیں تو پہلے اٹھ بیٹھتی ہیں، پھر پیٹھ کو اوپر اٹھاتی ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں زور سے پھیلاتی ہیں۔ آپ بھی صبح سویرے اٹھ کر اسی طرح اپنے بدن کو حرکت دیا کریں۔ یہ اچھی اور مفید ورزش ہے۔

میں نے آپ کا بڑا وقت ضائع کیا۔ خیال نہیں تھا بات اتنی لمبی ہوجائے گی۔ معافی چاہتی ہوں۔

چاند کی منچلی کرن

از
الطاف فاطمہ



کچے پکے مکانوں والی چھوٹی سی بستی سے کچھ فاصلے پر کھیتوں میں کھڑی مونگیا اور گہرے سبز رنگ کی نئی نئی فصل پر چاند کی کم زور کرنیں لرز رہی تھیں۔ زمین پر پھیلی ہوئی ساری بدصورتی کو اندھیرے نے اپنے دامن میں چھپا رکھا تھا اور کبھی کبھی چاند کی ننھی ننھی سی بزدل کرنیں اندھیرے کی آنکھ بچا کر اس کا دامن کھینچ لیتی تھیں تو پھر کہیں کہیں سے زمین کے بدنما اور بدصورت داغ بھی جھلک پڑتے تھے۔

اور یہ چاند کی دس تاریخ تھی۔ پورا چاند کہ جس کو ماہ کامل کہتے ہیں نکلنے میں ابھی پورے چار دن باقی تھے۔ آج کی تاریخ چاند نگر کی پریوں کی سیر کی تاریخ تھی۔ چاند نگر کے بادشاہ نے اپنے دیس کی پریوں کو کبھی پورے چاند کی تاریخوں میں نیچے اترنے کی اجازت نہ دی تھی، اس لیے کہ اس کو ڈر تھا کہ پورے چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی مگر شفاف کرنیں اندھیرے کے دامن میں چھپی ہوئی زمین کی ساری بدصورتی اور دکھوں کو ظاہر کر دیتی ہیں اور اسے ڈر تھا کہ اگر اس کے دیس کی پریوں نے اپنی خوب صورت پلکوں سے ڈھکی معصوم آنکھوں سے زمین کے اتنے ڈھیر سارے دکھوں کو دیکھ لیا تو ان کے دل دھڑکنا بند کر دیں گے، ان کی آنکھیں جھپکنا بھول جائیں گی اور وہ ہمیشہ کے لیے مسکرانا بند کر دیں گی۔ وہ انسان تو نہ تھیں،

جو اپنے اردگرد اتنی بدصورتی اور اتنے دکھوں کو دیکھ کر بھی محض اپنی خاطر مسکراتا رہتا ہے۔

وہ تو بہت نازک نازک اور خوشبوؤں میں لسی ہوئی ننھی منی پریاں تھیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ میری اور تمھاری انگلیوں کے برابر۔ تم اور میں اگر ان کو دیکھ پائیں تو جانیں کہ وہ کسی بہت ہی اونچے ٹھنڈے برفیلے پہاڑوں کی خوبصورت وادیوں سے اڑ کر آنے والی تتلیاں ہیں۔

ہاں تو پھر کیا ہوا بھئی کہ اچانک ہی ایک ننھی سی کمزور سی کرن، جو تھی تو بہت ننھی منی پر بزدل نہ تھی، چاندنگر کی پریوں کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ رنگ برنگے لباسوں میں شبنم کے ننھے ننھے قطروں کے زیور پہنے وہ ننھی منی پریاں فصلوں کے درمیان اتریں اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ناچنے لگیں۔

یہ دنیا کتنی خوب صورت، خاموش اور ہری بھری تھی۔ نئی فصلوں کے پودے اناج کی بالیوں کے بوجھ سے جھکے جا رہے تھے اور ان میں سے میٹھی میٹھی خوش بو اُڑ اڑ کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

اچھے سے اچھے اور نازک سے نازک پھولوں کی خوشبو سے بھی پیاری خوشبو۔ ہلکے پیازی اور روپہلے لباس والی پریوں کی شہزادی نے اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر ایسی لمبی سانس لی، جیسے وہ اس خوشبو کو پیتی چلی جا رہی ہو۔

یہ فصلیں کتنی مضبوط ہیں! اور ان کی خوشبو کتنی نازک! آہ میں اُن ہاتھوں کو دیکھنا چاہتی ہوں، جنھوں نے یہ فصلیں اگائی ہیں"۔

اپنی سہیلیوں کے جُھنڈ میں گھری ہوئی شہزادی نے ناچتے ناچتے رک کر کہا اور وہ گیہوں کے پودے کے ایک مضبوط سے پتے پر بیٹھ گئی۔

"تم ان ہاتھوں کو مت دیکھنا۔ شہزادی تم بہت دُکھی ہو جاؤ گی۔"

چاند کی وہ ننھی سی کرن بُدبُدائی۔

شہزادی چونکی اور اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس کو ہر سو پھیلی ہوئی مدھم اور بزدل چاندنی کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔

اور کرن برابر کہتی رہی،

"وہ ہاتھ کھردرے اور سخت ہیں۔ ہل چلا چلا کر اور درانتی پکڑ پکڑ کر ان میں گٹے پڑ گئے ہیں ان مضبوط انگلیوں کے ناخن جگہ جگہ سے گھِس گئے ہیں اور پکی فصلوں کے اناج کی بالیاں اتارنے میں بالیوں میں لگے سخت سوئیوں جیسے بالوں نے ان کی ہتھیلیاں چھید دی ہیں۔ شہزادی اور تمھارے ہاتھ روئی کے گالوں جیسے نرم اور نازک ہیں"۔

مگر ایسے نرم ہاتھ کس کام کے جو کچھ بھی تو نہ کر سکیں۔ شہزادی نے غصے میں پھول کی پنکھڑیوں جیسے اپنے ننھے منے گلابی ہاتھ جھٹکے اور پھر اس نے کہا،

"مگر تم کون ہو؟ مجھے بھی ایسے ہاتھ لا دو، جو کسی کے کام آسکیں اور کچھ کر سکیں۔"

"شہزادی ایسی باتیں نہ کرو۔ دیکھو جب یہ ہاتھ تھک جاتے ہیں تو بہت دُکھ اٹھاتے ہیں۔ ایسے ہاتھ ہمیشہ خالی رہتے ہیں۔ جب وہ چلنا بند کر دیتے ہیں تو پھر اُن کی زمینیں فصلوں سے خالی پڑی رہتی ہیں۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو!" شہزادی نے غصّے سے کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بولا کرتی۔" ننھی سی کرن جھوٹ کے نام پر ہی لرز گئی، "میں انسان تو نہیں جو جھُوٹ بولوں۔

اگر تم کہو تو میں تم کو دکھا دوں کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"ضرور دکھاؤ!"

"مگر بادشاہ کے غصّے سے مجھے کون بچائے گا، جو تم کو کچھ ہو گیا۔"

"میں بچاؤں گی۔ جب تم کو کچھ نہیں ہوا تو مجھے کیوں ہونے لگا۔"

چاند کی وہ ننھی سی کرن شہزادی کی بھُول پر ہنسی اور اس سے بولی، "اچھا تو پھر تم میرے پیچھے چلو!"

دبے قدموں وہ دونوں پریوں کے گھیرے سے نکل گئیں۔ ہری ہری فصلوں کے درمیان چلتے چلتے وہ کرن زمین کے ایک خالی سنسان اور افسردہ ٹکڑے پر رک گئی، "لو دیکھو، وہ زمین بِن بوئی جوتی پڑی تھی، اس پر ہریالی کا نام نشان بھی نہ تھا۔"

"ہائیں یہ زمین اتنی اُداس کیوں ہے؟"

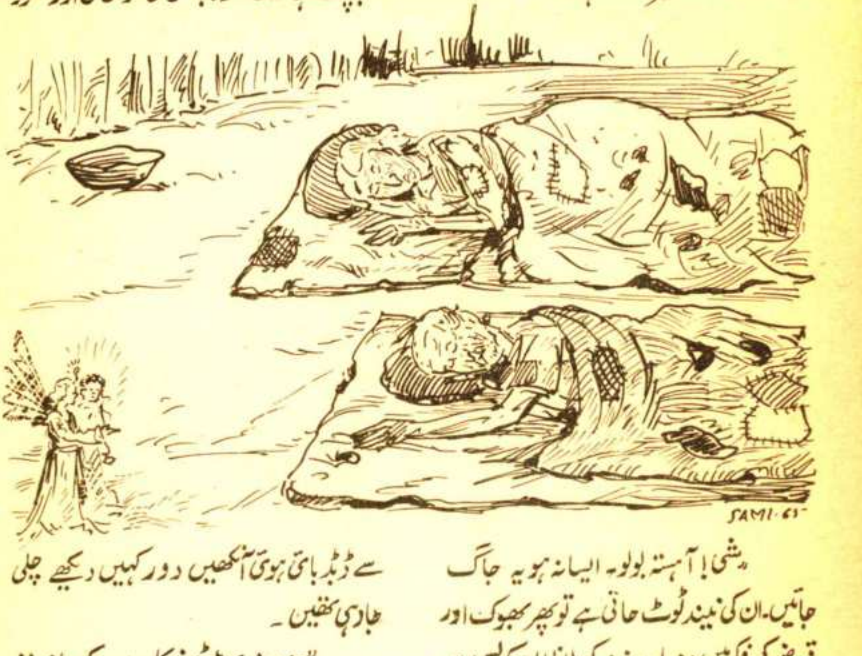
شہزادی ٹھٹک گئی۔

"اس زمین کے مالک کے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ کبھی وہ ہاتھ بھی ہری بھری اور مضبوط فصلیں اگایا کرتے تھے اور اب وہ کمزور ہو گئے ہیں۔ وہ درانتی کے بوجھ سے لرزنے لگتے ہیں۔" کرن نے کہا۔

سر جھکائے پریوں کی شہزادی اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی پھر وہ چاند کی کرن چلتے چلتے رکی اور بولی، "اگر تم اس وقت اڑنا چاہتی ہو تو پھر میرے پیچھے پیچھے اڑتی آؤ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

بغیر جواب دیے شہزادی نے پر تولے اور کرن کے ساتھ ساتھ اڑنے لگی۔ پُرانے اور بوسیدہ چھپّر سے ڈھکی ہوئی دیواروں والے مکان کے ساتھ والا مویشیوں کا تھان خالی تھا۔ اس میں بنی ہوئی ناندیں ٹوٹ رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے دونوں مکان کے اندر داخل ہوئیں، مکان ہر قسم کے سامان سے خالی تھا۔ پھٹے پرانے لحافوں میں دبکے ہوئے بڈھے اور بڑھیا کے تھکے اور جھُریائے ہوئے چہرے نظر آرہے تھے۔

"یہ کتنے تھکے ہوئے اور بھوکے نظر آرہے ہیں" اس نے دھیرے سے کہا۔



"شش! آہستہ بولو۔ ایسا نہ ہو یہ جاگ جائیں۔ ان کی نیند ٹوٹ جاتی ہے تو پھر بھوک اور قرضے کی فکر میں دوبارہ نیند کو بلانا ان کے بس سے باہر ہوتا ہے۔"

"آؤ ہم باہر چلیں۔ آؤ نا شہزادی، تم کس سوچ میں کھڑی ہو۔"

شہزادی چپ چاپ باہر نکل آئی۔

دوسری صبح چاند نگر میں ہر ایک کی زبان پر شہزادی کی عجیب وغریب بیماری کا ذکر تھا۔

وہ صبح اٹھی تو روز کی طرح نہ مسکرا رہی تھی اور نہ اس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح خوشی خوشی جھپک رہی تھیں۔ وہ بالکل خاموش تھی اور آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دور کہیں دیکھے چلی جا رہی تھیں۔

"ضرور میری بیٹی نے کل رات کی چاندنی میں زمین کا کوئی دکھ اور بدصورتی دیکھ لی ہے۔" چاند نگر کے بادشاہ نے فکرمندی سے کہا۔ "اور یہ کس کی شرارت ہے؟"

"مگر ایسا کس طرح ہو سکتا ہے رات اتنی دھندلی اور کہر آلود تھی۔ ایسے میں زمین کا ہر عیب اندھیرے کے دامن میں چھپ جاتا ہے۔" ملکہ نے کہا۔

اور پھر بادشاہ نے حکم دیا کہ کل رات جتنی

بھی کرنیں زمین پر اتری تھیں ان سب کو حاضر کیا جائے۔

چاند کی ساری مدھم اور کمزور کرنیں ایک کے بعد ایک خاموشی سے بادشاہ کے سامنے جا کھڑی ہوتیں۔ ان سب میں سے ایک بھی اس قابل نہ تھی، جو اندھیرے کا دامن کھینچ کر زمین کی بدصورتی کو ظاہر کرسکتی۔

"مگر وہ دس تاریخ کو نیچے جانے والی سب سے چھوٹی کرن کدھر ہے، وہ آج سامنے کیوں نہیں آئی؟ اس کو حاضر کیا جائے۔" ملکہ نے سوال کیا۔

کئی تیز اور روشن کرنوں کے درمیان گھری ہوئی وہ کرن سامنے آئی۔ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہ تھی۔ بادشاہ نے اس سے سوال کیا،

"رات تم نیچے گئی تھیں؟"

"جی ہاں میں گئی تھی۔" کرن نے آہستہ سے جواب دیا۔

"لیکن کیا تم کو منع نہیں کیا گیا تھا کہ چوں کہ تم بعض وقت بہت تیز ہو جاتی ہو، اس لیے دس تاریخ کو نیچے نہیں جاؤ گی۔"

"جی ہاں مجھے منع کیا گیا تھا۔" اس نے مضبوطی سے کہا۔

"پھر تم نے حکم کی تعمیل کیوں نہ کی؟" بادشاہ نے جھنجھلا کر پوچھا۔

وہ پھر بڑی آہستگی سے بولی۔

"میں نیچے گئی تھی، اس لیے کہ میں جانا چاہتی تھی۔"

"گستاخ! تو کس لیے میرے حکم کے خلاف کرنا چاہتی تھی۔" بادشاہ گرجا۔

"اس لیے کہ میں اس بیمار بوڑھے کا حال کسی کو دکھانا چاہتی تھی، جس کی زمینیں بغیر بوئے جوتی پڑی ہیں جو بھوکوں مر رہا ہے اور جس کو دوا تک نہیں ملی۔"

"مگر اس کا یہ حال دیکھنے کو اس کی بستی کے لوگ کم تھے جو تونے شہزادی کو دکھا کر بیمار کر دیا؟" اچانک ہی بادشاہ نے گرج کر سوال کیا، "تجھے خبر ہے کہ ایسی نافرمانی کی کیا سزا ہے؟"

"مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھے چاند کے ٹھنڈے روپہلے غاروں میں سینکڑوں برسوں کے لیے قید کر دیں گے۔" وہ دلیری سے بولی۔

"تو پھر؟ تو پھر تو نے ایسی حرکت کیوں کی؟" بادشاہ کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹ گئیں۔

"مجھے معلوم تھا لیکن میں نے پھر بھی یہ حرکت کی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، "میں نے اتنے دن انتظار کیا تھا کہ اس بستی کے لوگ اس کے حال کو دیکھیں، لیکن ان کو اپنے

کاموں اور اپنی باتوں سے فرصت نہ تھی اور اب میں اسے زیادہ اکیلے اکیلے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میرے سوا کوئی اور بھی اس بوڑھے کا حال دیکھے۔ اس بڈھے نے اپنے کمزور ہاتھوں سے اس زمین کو جوتا تھا اور بیج ڈالے تھے، مگر اس کی بیماری نے اس کو دیکھ بھال کی فرصت نہ دی اور اس کی زمین بے فصل کے پڑی رہ گئی"۔

"تو اب تجھے کیا فائدہ مل گیا، اور شہزادی بیمار ہو گئی سو الگ،" ملکہ نے جل کر کہا، "اب اس کا علاج کسی کے بس کا نہیں — برسوں گزرے میری نانی کی نانی نے بھی ایسی ہی کوئی چیز دیکھ لی تھی اور وہ ایسے ہی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے دیکھتے پتھر کی ہو گئی تھیں۔ آہ میری بچی! تیرا بھی یہی حال ہو گا۔" ملکہ سسکیوں سے رونے لگی۔

"ملکہ عالیہ، آپ اس طرح مایوس نہ ہو جائیے! شہزادی کا علاج مجھے معلوم ہے۔" ننھی سی کرن ملکہ کے آگے جھک گئی۔

"وہ کیا علاج ہے؟ بدبخت بول چک" بادشاہ غصے سے تھرتھرا رہا تھا۔

"بہت آسان علاج ہے عالم پناہ!" وہ اسی اطمینان سے بولی،

"آپ اس بوڑھے کی فصل کے تیار ہونے اور پھلنے پھولنے کا سامان کر دیجیے۔"

"وہ کس طرح؟ میں نہ انسان ہوں اور نہ خدا، جو اس طرح کے کام کر سکوں۔" بادشاہ نے بے بسی سے کہا۔

"آپ نہ انسان ہیں اور نہ خدا، لیکن آپ کی مملکت کے سینکڑوں بونے مل کر ایک انسان کے برابر کام ضرور کر سکتے ہیں۔ اگر آپ ایسا کر دیں گے تو میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ شہزادی تن درست ہو جائے گی۔"

"ہوں!" بادشاہ نے کچھ سوچا اور پھر رک کر بولا، "مگر تم اس وقت تک چاند کے روپہلے اور ٹھنڈے غاروں میں قید رہو گی۔"

"مجھے اس سے بھی سخت سزا منظور ہے عالم پناہ!" وہ اطمینان سے بولی۔

چھ ماہ تک وہ چاند کے روپہلے اور ٹھنڈے غاروں میں قید رہی۔ وہ ہری بھری فصلوں کے نظاروں کو ترس گئی۔ وہ گھروں کی چھتوں اور مسجدوں کی برجیوں کی صورتیں تک بھول چکی تھی، لیکن اس تمام عرصے میں ننھے منے روپہلی لباس والے بونے راتوں کو چپکے چپکے اپنے کام میں مصروف رہے۔

ہر صبح بوڑھے بیمار بابا اور اس کی بوڑھی بیوی کو نئی سے نئی خبر ملتی۔ بابا کے کھیتوں پر کسی نے راتوں رات ٹریکٹر چلا دیا، کسی نے بابا کے کھیتوں میں بیج ڈال دیے۔ بابا کے کھیتوں کو

پانی مل رہا ہے۔

بابا اور اس کی بڑھیا ان خبروں پر یقین بھی نہ کرتے۔ پھر بابا کے کھیتوں میں پودوں نے سر اٹھایا اور بستی کے لوگ اس کے اچھے دن آتے دیکھ کر بابا اور اس کی بڑھیا کی خبر لینے لگے۔

دھیرے دھیرے ان کی بیماری دور ہوتی گئی اور ایک دن ایسا آیا کہ وہ اپنی لاٹھیاں ٹیکتے ہوئے اپنے کھیتوں پر گئے تو ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان کے کھیتوں پر سب سے گھنی اور موٹی موٹی بالوں والی سنہری فصل خریف کی ہوا میں جھوم رہی تھی .... چاروں طرف سونا سا بکھر رہا تھا اور اس رات روپہلی تیر اور کمانیں تانے ہوئے سینکڑوں بولنوں کے پہرے میں چاند نگر کی شہزادی اس ننھی سی کمزور مگر من چلی کرن کی ہمراہی میں اڑتی ہوئی نیچے آئی تو اس کی ٹھیری ہوئی پھٹی پھٹی آنکھیں جھپک گئیں۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی اس کے منہ سے نکلا، "شکر ہے۔"

"بچو، اب تم بتاؤ کہ اس کرن کو چاند کے روپہلے ٹھنڈے غار کی قید سے رہائی ملی یا نہ ملی؟"

★

انعامی کارٹون

جنوری ۱۹۶۵ء کے ہمدرد نونہال میں جو انعامی کارٹون شائع ہوا تھا اس کا صحیح عنوان ہے:

گشتی کتب خانہ

افسوس ہے کہ یہ صحیح عنوان کسی نونہال نے نہیں بھیجا۔

فروری ۱۹۶۵ء کے ہمدرد نونہال میں جو انعامی کارٹون شائع ہوا تھا اس کا صحیح عنوان ہے:

وقت پر کام

اُردو کے محاورہ کے مطابق وقت پر کام کرنے کا مطلب ہوتا ہے، صحیح وقت پر کام کرنا۔

نونہالوں میں سے یہ عنوان صرف ایک نونہال نے لکھ کر بھیجا ہے، اس لیے وہی انعام کے مستحق ہوئے، ان نونہال کا نام یہ ہے:

مظاہر حبیب، درجہ دہم، سیکشن بی،
گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول ۲ جہانگیر روڈ۔ کراچی

مظاہر حبیب کو انعام کی کتاب جلد روانہ کردی جائے گی۔

مارچ میں شائع ہونے والے انعامی کارٹون کا صحیح حل مئی ۱۹۶۵ء کے ہمدرد نونہال میں شائع کیا جائے گا۔

With Compliments from
the best Plastic Manufacturer

MANIAR PLASTIC INDUSTRIES
KARACHI

سلیقہ

اُستاد کے سامنے ادب سے بیٹھو، اِدھر اُدھر مت دیکھو، اپنے دامن یا کتاب کے ورق سے نہ کھیلو، کتاب کا ادب کرو، قرآن شریف یا کتاب پر کوئی چیز نہ رکھو، قلم دوات کتاب سے الگ رکھو، قرآن شریف یا کتاب کے ورقوں کو مَل دَل کر خراب نہ کرو۔

کُھل کر بیٹھو، کُھچ بِچ اور ایک دُوسرے میں گُھس کر نہ بیٹھو، قطار سیدھی رکھو، پڑھنے کے وقت ہِلو نہیں، منھ سے سیٹی مت بجاؤ، اُنگلیاں مت چٹخاؤ، بڑوں کے سامنے ننگے سَر مت بیٹھو۔

جوتے قطار میں اُتارو، جُوتوں پر جُوتے نہ چڑھاؤ۔

جمائی لینا اچھا نہیں ہے، اگر جمائی آجائے تو منھ پر ہاتھ رکھ لو۔ آواز نہ نکلنے دو، سب کے سامنے انگڑائی لینا بُری بات ہے۔

کھانسی کو دباؤ، مجبوری ہو تو لوگوں کے سامنے سے منھ پھیر کر دوسری طرف کو کھانسو۔

چھینکنے کے وقت اپنا منھ سامنے سے دوسری طرف پھیر لو، چہرے پر ہاتھ رکھ لو، چھینکنے کے بعد کہو اَلحَمدُ لِلّٰہِ۔ کسی دوسرے کو چھینک آئے اور وہ اَلحَمدُ لِلّٰہ کہے تو تم کہو یَرحَمُکَ اللّٰہُ ○

خلیق

ٹیلیفونیا



چڑیا گھر کا افسر : ڈاکٹر صاحب، جلدی اپنا جراحی کا سامان لے کر آئیے۔ میرے شتر مرغ کو شاید ٹیلیفونیا ہو گیا ہے۔ جلدی کیجیے!

ڈاکٹر : میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ یہ کیا بیماری ہے ؟

افسر : آپ مریض کو دیکھ کر سب کچھ سمجھ جائیں گے۔ جلدی آئیے، دیر نہ کیجیے۔ مریض کی جان کا خطرہ ہے۔ اور میرے ٹیلیفون کا نقصان الگ۔



زمین پر پائی جانے والی اگوانا (چھپکلی) جو چار فیٹ لمبی ہوتی ہے ۔

تاریک برّاعظم کے جانور

مناظر صدیقی

نسرین اور خورشید میں ہمیشہ یہی جھگڑا رہتا کہ نسرین کے جانوروں کو ستانا خورشید کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ نسرین کو جانوروں سے بہت محبت تھی اور خورشید کو اُن سے نفرت۔ نسرین کی عادت یہ تھی کہ خواہ کوئی بھی جانور ہو، وہ اُسے پالنے کی کوشش کرتی اور خورشید اُنھیں مارنے کی کوشش کرتا تھا۔ جانوروں سے نسرین کی ہمدردی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ گھر میں چیونٹیاں نکل آتیں تو وہ اُن کے بلوں پر آٹا ڈالتی پھرتی، خواہ اُسے امّی کی گھُرکیاں ہی کیوں نہ سُننی پڑیں اور خورشید چیونٹیوں کو دیکھ پاتا تو مٹی کا تیل چھڑک کر اُنھیں جلانے کی کوشش کرتا۔

نسرین نے جہاں اور بہت سے جانور پال رکھے تھے، وہیں ایک گلہری بھی پلی ہوئی تھی، جو نسرین سے اتنی ہِلی ہوئی تھی کہ دُور سے نسرین کو دیکھتی تو پُھدک کر نسرین کے کندھوں پر بیٹھ جاتی۔

خورشید دوسرے جانوروں کی طرح اُس گلہری کا بھی دشمن تھا۔ ہمیشہ اس تاک میں رہتا کہ کسی نہ کسی طرح ایک قمچی مار کر گلہری کا کام تمام کر دے۔ گھر میں اگر کبھی کوئی چھپکلی نظر آجاتی تو بس یُوں سمجھ لو کہ خورشید کو اُس وقت تک چین ہی نہ آتا جب تک چھپکلی کو جان سے نہ مار لے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے اور ابّو میاں اُن سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ خورشید کو اُسی کمرے میں ایک چھپکلی نظر آگئی۔

نہ جانے بیچاری کہاں سے آگئی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی خورشید کی بے چینی بڑھ گئی۔ جی میں تو آیا کہ سب کا خیال بُھول کر فوراً ایک چپّی مارے اور چھپکلی کو نیچے گرا دے۔ اگرچہ ابو میاں کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا، لیکن اُس کی نظریں چھپکلی پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ ابو میاں خورشید کی شکل دیکھ کر ہی سمجھ گئے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ انھوں نے سامنے بیٹھے ہوئے مہمان سے کہا،

"اختر بھائی، اب اس چھپکلی کی خیریت نہیں۔"

وہ مہمان جن کا نام ابو نے اختر بھائی لیا تھا، شاید ابو میاں کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ پھر ابو میاں نے جب تفصیل سے خورشید کے متعلق اُنھیں بتایا کہ وہ جانوروں کا کتنا بڑا دشمن ہے تو وہ پہلے تو بڑے زور سے ہنسے، پھر اُنھوں نے خورشید سے مخاطب ہو کر کہا، "تو آپ چھپکلیوں کے شکاری ہیں۔" خورشید اس جملے پر کچھ جھینپ سا گیا۔ اختر بھائی نے اُس سے پوچھا،

"اچھا یہ تو بتاؤ تم نے اب تک کتنی چھپکلیاں ماری ہوں گی؟"

"بہت سی۔" خورشید نے مختصر سا جواب دیا۔

"اب تک تم نے جتنی چھپکلیاں ماری ہیں، اُن میں سب سے بڑی چھپکلی کتنی بڑی تھی؟" اختر بھائی نے پوچھا۔

"اتنی بڑی" خورشید نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"بس تو پھر تم نے چھپکلی نہیں ماری۔ چھپکلی کے بچے مارے ہیں۔ چھپکلی تو چار چار فیٹ لمبی ہوتی ہے۔" اختر بھائی نے کہا۔

"ہم نے تو اتنی بڑی چھپکلی کہیں بھی نہیں دیکھی۔" خورشید نے کہا۔

"ہم نے تو دیکھی ہے اتنی بڑی چھپکلی۔" اختر بھائی نے کہا۔

"ہمیں تو یقین نہیں آتا، کہیں اتنی بڑی چھپکلی بھی ہو سکتی ہے۔" خورشید نے تعجب ظاہر کیا۔

"تم اپنی بہن نسرین کو بھی بلا لو تو ہم تمھیں بتائیں کہ ہم نے اتنی بڑی چھپکلی کہاں دیکھی ہے اور چھپکلی کے علاوہ کون کون سے جانور دیکھے ہیں۔" اختر بھائی نے کہا۔

خورشید دوڑ کر نسرین کو بُلا لایا تو اختر بھائی نے کہا، "دیکھو نسرین، یہ تمھارے بھائی چھپکلیوں کے شکاری ہیں، لیکن انھوں نے کبھی چار فیٹ لمبی چھپکلی کے متعلق نہیں سُنا۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہم چار فیٹ لمبی چھپکلی دیکھ چکے ہیں تو اُنھیں ہماری بات کا یقین ہی نہیں آتا، اس لیے ہم نے تمھیں بُلایا ہے تاکہ ہم تمھارے سامنے اُنھیں بتائیں ہم نے اتنی بڑی چھپکلی کہاں دیکھی ہے۔"

"اتنی بڑی چھپکلی کے متعلق تو ہم نے کبھی

نہیں سُنا اور خورشید بھائی صرف چھپکلیوں ہی کے شکاری نہیں بلکہ یہ تو ہر جانور کے دشمن ہیں۔" نسرین نے کہا۔

"بھئی یہ تو بڑی بُری بات ہے" اختر بھائی نے کہا۔

نسرین بولی" میری گلّو کو بھی یہ تنگ کرتے رہتے ہیں۔"

"گلّو کون ؟" اختر بھائی نے پوچھا۔

"ہماری نسرین بیٹی نے ایک گلہری پال رکھی ہے، اُس کا نام انھوں نے گلّو رکھا ہے۔" ابو نے اختر بھائی کو بتایا۔

"اچھا تو اب یہ بتاؤ کہ ہم تمہیں پہلے گلہریوں کے متعلق کچھ بتائیں یا چھپکلیوں کے متعلق؟" اختر بھائی نے دونوں بچّوں سے سوال کیا۔

"پہلے تو آپ چھپکلیوں کے متعلق بتائیے کہ چار فیٹ لمبی چھپکلیاں آپ نے کہاں دیکھی ہیں ؟" دونوں بچّوں نے ایک ساتھ کہا۔

"اچھا تو پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے تاریک براعظم کا نام سُنا ہے ؟" اختر بھائی نے پوچھا۔

"جی ہاں، مجھے معلوم ہے۔" خورشید نے کہا۔

"اچھا، تو بتاؤ تو سہی کہ تاریک براعظم کسے کہتے ہیں اور کیوں کہتے ہیں ؟" اختر بھائی نے پوچھا۔

"تاریک براعظم، افریقہ کو کہتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ افریقہ میں اتنے گھنے جنگلات ہیں کہ بعض جگہ تو دن کے وقت بھی اندھیرا ہی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ان جنگلوں میں خوفناک جانور اور آدم خور انسان بھی رہتے ہیں، جس کی وجہ سے اس برِّ اعظم کے بہت سے حصوں میں عام انسان ابھی تک نہیں پہنچ سکے، اسی لیے اس کو تاریک براعظم کہا جاتا ہے۔" خورشید نے جواب دیا۔

"شاباش !" اختر بھائی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "ایک مرتبہ ہمیں امریکا جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں سے لَوٹتے وقت ہم ایک ضروری کام سے افریقہ بھی گئے تھے۔ امریکا کے عجائب گھروں اور افریقہ کے بعض جنگلوں میں ہم نے بہت سے عجیب عجیب جانور دیکھے تھے۔ جس چھپکلی کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ افریقہ ہی میں پائی جاتی ہے۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک قسم زمین پر پائی جاتی ہے اور دوسری قسم پانی میں پائی جاتی ہے۔ ان چھپکلیوں کو انگریزی میں اِگوانا (IGUANA) کہتے ہیں۔

زمین پر پائی جانے والی چھپکلی تو عام گھاس پات کھا کر زندہ رہ سکتی ہے، لیکن آبی چھپکلی ایک خاص قسم کی سمندری گھاس کھاتی ہے جو ہر جگہ نہیں مل سکتی۔ یہ چھپکلی یا اِگوانا اتنی کثرت سے انڈے دیتی ہے کہ جب اُن انڈوں سے بچّے نکلتے ہیں تو زمین پر اتنی جگہ بھی باقی نہیں رہتی کہ ایک خیمہ بھی گاڑ لیا جائے۔ اب تو ان کی نسل کم ہوتی جا رہی ہے، لیکن پھر بھی زمین پر پائی جانے والی اگوانا

دوسری جگہ رکھی جا سکتی ہے اور زندہ بھی رہتی ہے۔ البتہ آبی اگوانا صرف ایک خاص علاقے میں زندہ رہ سکتی ہے۔ یہ ایک سمندر کی گھاس کھاتی ہے، جو سمندر کے کناروں کی چٹانوں پر سے پانی ہٹ جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بڑی محنت اور کوشش سے نیویارک کے چڑیا گھر میں ان چھپکلیوں کی چھے مختلف قسموں کو پالا گیا ہے۔"

ابھی اختر بھائی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ نسرین نے بیچ میں ٹوکا۔

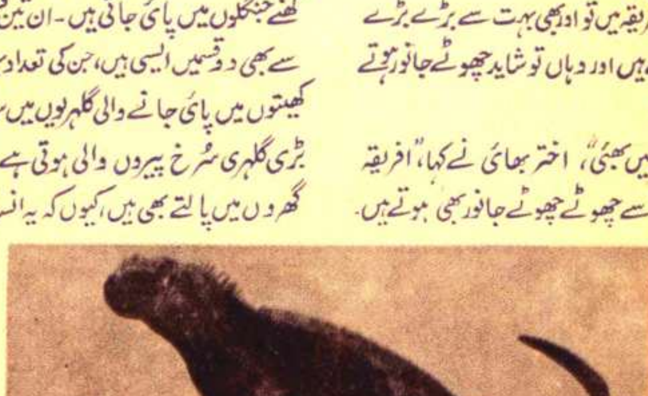
"افریقہ میں تو اور بھی بہت سے بڑے بڑے جانور ہوتے ہیں اور وہاں تو شاید چھوٹے جانور ہوتے ہی نہیں۔"

"نہیں بھئی"، اختر بھائی نے کہا، "افریقہ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جانور بھی ہوتے ہیں۔ آج ہم تمھیں افریقہ کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کے متعلق ہی بتائیں گے۔"

"پہلے تو آپ افریقہ کی گلہریوں کے متعلق بتائیے۔" نسرین نے کہا۔

"اچھا بھئی، چلو یوں ہی سہی۔" اختر بھائی نے کہا اور پھر انھوں نے بتایا،

"افریقہ میں یوں تو گلہریوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، لیکن ان میں سے سات قسمیں بہت زیادہ مشہور ہیں اور آسانی سے مل جاتی ہیں۔ ان میں چار قسمیں تو کھیتوں وغیرہ میں مل جاتی ہیں اور باقی تین قسمیں گھنے جنگلوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان تین قسموں میں سے بھی دو قسمیں ایسی ہیں، جن کی تعداد بہت کم ہے۔ کھیتوں میں پائی جانے والی گلہریوں میں سب سے بڑی گلہری سرخ پیروں والی ہوتی ہے۔ اسے لوگ گھروں میں پالتے بھی ہیں، کیوں کہ یہ انسانوں سے



پانی کی چھپکلی۔ یہ بھی چار فیٹ لمبی ہوتی ہے۔

بہت جلد ہل جاتی ہے اور یہ گلہری دوسری گلہریوں کے مقابلے میں زیادہ بھی پائی جاتی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ شام کو روزانہ یہ درختوں کے سوکھے تنوں پر اِدھر اُدھر بھاگتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اِن ہی کھوکلے تنوں میں اس گلہری کے رہنے کے سوراخ ہوتے ہیں۔ رات گزارنے کے لیے یہ گلہری جن درختوں کا انتخاب کرتی ہے وہ عام طور پر دُور دُور اور الگ تھلگ ہوتے ہیں۔ ان درختوں کی وجہ سے انسانوں کو یہ گلہری بڑی آسانی سے نظر آجاتی ہے، کیوں کہ روزانہ شام کو اپنے سونے کے لیے درختوں سے تازہ پتے توڑ کر اپنے گھونسلے میں گھستی ہے تو لوگ آسانی سے دیکھ لیتے ہیں۔"

"پتے کیا کھانے کے لیے توڑتی ہے؟" خورشید نے سوال کیا۔

"نہیں، کھانے کے لیے نہیں، بلکہ بستر بنانے کے لیے توڑتی ہے" اختر بھائی نے جواب دیتے ہوئے کہا، "یہ گلہری روزانہ اپنے سونے کے لیے تازہ تازہ پتوں کا نرم نرم بستر تیار کرتی ہے۔ اب دوسری گلہریوں کے متعلق سنو۔" اختر بھائی نے بات جاری رکھی، کھیتوں میں پائی جانے والی دوسری گلہری عام طور پر زمین میں دبکی پھرتی رہتی ہے۔ اس گلہری کو کبھی لوگوں نے آٹھ یا دس فیٹ سے زیادہ بلندی پر نہیں دیکھا۔

"تو کیا یہ چوہوں کی طرح بلوں میں رہتی ہے؟" نسرین نے پوچھا۔

"نہیں" اختر بھائی نے جواب دیا، "یہ چوہوں



کھیتوں میں پائی جانے والی گلہری جس کے پیر لال رنگ کے ہوتے ہیں اور منھ بھی لال ہوتا ہے۔ اس کی پیٹھ فاختئی رنگ کی ہوتی ہے اور دُم بہت زیادہ خوب صورت۔

کی طرح بِلوں میں تو نہیں رہتی، البتہ زیادہ بلندی پر بھی نہیں رہتی۔ اپنے رہنے کے لیے ریشے دار چیزوں کا بستر بناتی ہے۔ ان گلہریوں کی سب سے چھوٹی قسم ہرے رنگ کی ہوتی ہے۔ دُم کے سوا اس کا قد تقریباً پانچ اِنچ ہوتا ہے اور دُم تقریباً سات اِنچ کی ہوتی ہے۔ اس کی کھال بڑی خوب صورت ہوتی ہے۔ پورے بدن پر ہری ہری چتّیاں پڑی ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے ٹڈے اور کیڑے بڑے شوق سے کھاتی ہے۔

ہرے رنگ کی گلہریوں کی ایک قسم اور ہوتی ہے، جس کے بازوؤں پر سفید دھاریاں پڑی ہوتی ہیں اور پیلے اور گہرے رنگ کے دھبے بھی ہوتے ہیں۔ یہ گلہری پالی نہیں جا سکتی، کیوں کہ یہ ذرا جھگڑالو طبیعت کی ہوتی ہے۔ ہر جانور اور ہر چیز سے لڑنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ یہ سب گلہریاں عام طور پر درختوں کی سُرخ چھال اور ایک اخروٹ جیسا پھل بڑے شوق سے کھاتی ہیں جو افریقہ میں بڑی کثرت سے ملتا ہے۔ یہ قسمیں تو تھیں کھیتوں میں پائی جانے والی گلہریوں کی۔ اب ذرا جنگلی گلہریوں کے متعلق سُنو۔"

ابھی اختر بھائی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ اندر سے چائے بن کر آگئی اور ابّو نے کہا، "لیجیے اختر بھائی، پہلے چائے پیجیے، بعد میں سارے جانوروں کی تفصیل انھیں سُنائیے۔"

اختر بھائی نے چائے کا کپ تھامتے ہوئے کہا، "جنگل میں پائی جانے والی گلہریاں عام طور پر ان گلہریوں سے بڑی ہوتی ہیں۔ عام طور پر ایک ایک فٹ لمبی۔ یہ زیادہ تر اونچے اونچے درختوں



جنگل میں پائی جانے والی بڑی گلہری

یہ عام طور پر بہت کم نظر آتی ہے اور ایک فٹ کے قریب لمبی ہوتی ہے۔

کی چوٹیوں پر رہتی ہیں۔ ان جنگلی گلہریوں کی ایک قسم زمین پر بھی رہتی ہے۔ یہ قسم پورے افریقہ میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ اس کا رنگ بھورا ہوتا ہے اور ان پر سفید پٹیاں پڑی رہتی ہیں۔ دُم پر بہت گھنے بال ہوتے ہیں، البتہ یہ بال بالکل ملائم ہوتے ہیں۔ یہ تو تھا گلہریوں کا حال۔ اب کیا تم دوسرے جانوروں کے متعلق بھی سنو گے؟" اختر بھائی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" دونوں بچوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

اور اس کی رفتار بہت سُست ہوتی ہے۔ اس علاقے کے رہنے والے اس کو سلوتھ کہتے ہیں۔ یہ عام طور پر دن میں سوتا رہتا ہے۔ صرف رات کے وقت جاگتا ہے۔ عام طور سے گھنے جنگلوں میں رہتا ہے، جہاں دن بھر یا تو کھوکلے درختوں کے تنوں میں چھپا رہتا ہے یا اُونچے اُونچے درختوں کی شاخوں پر سوتا رہتا ہے۔ رات کے وقت یہ زمین پر اُتر آتا ہے اور زیادہ وقت زمین پر گزارتا ہے۔ زیادہ تر پھل وغیرہ کھاتا ہے، لیکن بہت سے جانور بھی غذا کے طور پر استعمال کرتا ہے،

اختر بھائی نے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی اور کہا، "ارے توبہ، وقت بہت کم رہ گیا ہے پھر بھی ہم تھوڑا بہت کچھ بتائیں گے ضرور۔ خیر سُنو!" انھوں نے کہنا شروع کیا، "مغربی افریقہ اور مڈغاسکر میں ایک خاص قسم کا جانور ہوتا ہے، جو بہت وزنی ہوتا



زمین پر پائی جانے والی ایک گلہری
جس کا رنگ بھورا اور دُم گھنی ہوتی ہے۔ اس کے بازوؤں پر سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔



سلوتھ
جو دن کو
درختوں پر
سوتا رہتا
ہے اور رات
کو زمین پر
اُتر آتا ہے

•



گیلاگو

مثلاً چھپکلی، کن کھجورا (ہزار پا) چڑیوں کے انڈے اور کیڑے مکوڑے وغیرہ بھی کھاتا ہے۔ سلوتھ کے علاوہ ایک اور جانور ہوتا ہے جسے "گیلاگو" کہتے ہیں۔ یہ افریقہ کے مختلف حصّوں میں، مثلاً کیپ ٹاؤن، یوگنڈا، کینیا اور سینگال وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ اس کا بدن بھی تقریباً ۵ انچ لمبا ہوتا ہے اور دُم ۷ انچ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ یہ جانور بھی دن کے وقت بہت کم نظر آتا ہے۔ رات کے وقت اس کی آواز سُنائی دیتی ہے اور یہ صرف اپنی آواز سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کی آواز کبھی زور سے اور کبھی مدھم رات بھر جنگلوں میں گونجتی رہتی ہے۔ اس کی رنگت بالکل چوہے کی طرح ہوتی ہے اور عام طور سے گھاس وغیرہ کھاتا ہے، لیکن کیڑے مکوڑے بھی بڑے شوق سے کھاتا ہے۔"

گیلاگو کے متعلق ساری تفصیل بتا کر اختر بھائی ایک لمحے کے لیے رُکے، پھر اُنھوں نے دونوں بچوں سے پوچھا، "تم نے چڑیا گھر میں ریچھ تو دیکھے ہی ہوں گے ؟"

"جی ہاں!" دونوں بچوں نے جواب دیا۔

"یہ ریچھ کی ہندوستانی قسم ہے۔" اختر بھائی



دا۔۔۔آ۔۔۔ کی آواز نکالنے والا ریچھ جو عام طور پر درختوں پر ہی رہتا ہے۔ درختوں کے پتوں پر اپنے بچے کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔

نے کہا،

"افریقہ میں ایک ریچھ ایسا بھی ہوتا ہے، جو عام طور پر درختوں پر ہی رہتا ہے۔ درختوں ہی کے پتّوں پر زندگی گزارتا ہے۔ گیلاگو کی طرح یہ بھی عام طور پر بہت کم نظر آتا ہے۔ لوگ اس کی آواز ہی سے اندازہ لگاتے ہیں کہ اس جگہ ریچھ موجود ہے۔ یہ جب چیختا ہے تو تقریباً ۲ دو منٹ تک مسلسل چیختا رہتا ہے۔ اس کی آواز بڑی زوردار ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بڑے زور سے "آ آ" کر رہا ہے۔ ان سبزی ترکاریوں پر گزر کرنے والے جانوروں کے علاوہ گوشت کھانے والے جانور بھی افریقہ میں بہت ہوتے ہیں، جن میں نیولا بہت مشہور جانور ہے اور نیولے کے علاوہ ایک خاص قسم کی بلّی بھی ہوتی ہے، جو عام طور سے درختوں پر رہتی ہے۔ اس بلّی کو "کیوٹ" کہتے ہیں۔ یہ بلّی ہماری بلّیوں کی طرح گوشت نہیں کھاتی، بلکہ کھیتوں کی فصلیں تباہ کرتی ہے اور اناج کھاتی ہے۔"

اختر بھائی نے ایک مرتبہ پھر اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور کہنے لگے، "اچھا بچو، اب بہت دیر ہوگئی اب ہم جاتے ہیں، آئندہ جب کبھی آئیں گے اور بہت سی نئی نئی اور عجیب باتیں تمھیں بتائیں گے۔" پھر اختر بھائی اَبّو سے ہاتھ ملا کر چلے گئے اور دونوں بچّے اپنے اپنے کھیل میں مصروف ہوگئے۔



نوٹ۔ ایک خاص قسم کی بلّی جو فصلیں تباہ کر دیتی ہے اور ننھے اور چھوٹے چھوٹے پودے شوق سے کھاتی ہے۔



بِلّی، بھوت اور اُلّو

ایک چھوٹے سے شہر میں ایک نواب صاحب ایک خوب صورت حویلی میں رہتے تھے، نواب صاحب کی بیگم صاحبہ نے ایک بِلّی پال رکھی تھی، جس کا نام اُنھوں نے رانی رکھا تھا۔ نواب صاحب نے اُن کی ضد پر ایک اُلّو پالا تھا۔ اُنھوں نے اُس کا نام چُغد رکھا تھا۔ نواب صاحب کے کوئی اولاد نہ تھی۔ تمام دن دونوں میاں بیوی ان جانوروں کی دیکھ بھال میں لگے رہتے تھے۔ ان کی زندگی بڑے آرام چین سے گزر رہی تھی۔ "بی رانی" اور "میاں چغد" کی بھی بڑی دوستی تھی اور خوب کھیل کود میں بسر کر رہے تھے۔ اس حویلی میں کہیں سے ایک بھوت آگیا۔ اُس نے "میاں چُغد" اور "بی رانی" سے خوب دوستی کرلی۔ سب اکٹھے کھاتے پیتے اور مِل جُل کر شرارت کرتے۔ رات کو بھوت بھی ان کے ساتھ ایک کونے میں چھپ جاتا۔ جس وقت نواب صاحب اور بیگم صاحبہ سو جاتے تو یہ تینوں اکٹھے بیٹھ کر مزے مزے کے قصّے کہانیاں آپس میں سُناتے۔ اس کے بعد "بی رانی" اور "میاں چغد" سو جاتے، مگر بھوت تھا بہت شریر۔ اس کو شرارت سُوجھتی اور وہ جلدی سے اُٹھ کر کسی کمرے کے دروازے کو

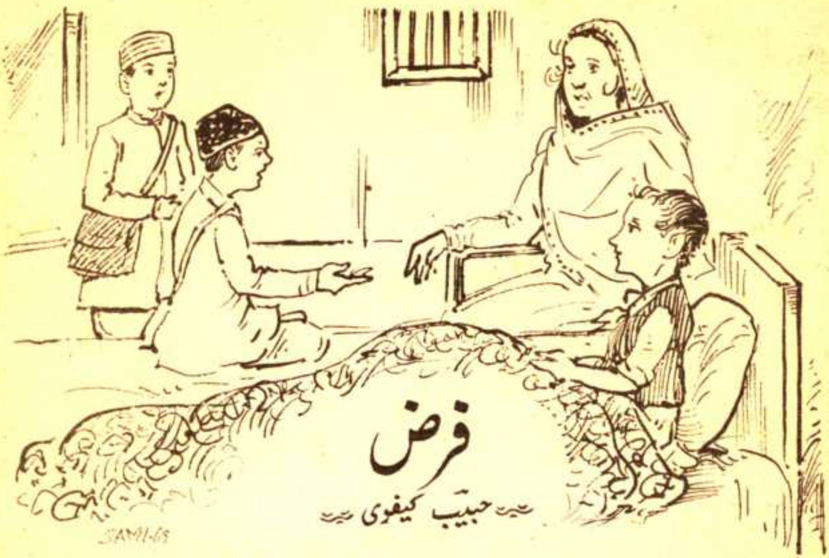
زور زور سے کھولنا اور بند کرنا شروع کر دیتا۔ کبھی کبھی نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے سونے کے کمرے میں جاکر چُوں چُوں، کھٹ پٹ کرنے لگتا۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ دونوں پریشان ہو جاتے اور جاگ کر اِدھر اُدھر دیکھتے، مگر وہاں کوئی نظر نہ آتا۔ بھوت چپکے چپکے اُن کے کمرے میں سے نکل کر ایک کونے میں چھپ جاتا۔ "بی رانی"، "میاں چغد" اور بھوت تینوں آپس میں دوست تھے، اس لیے "رانی" اور "چغد" اپنے مالکوں کو یہ کیسے بتاتے کہ یہ ساری شرارت ہمارے دوست بھوت کی ہے۔ آخر اس حویلی کا نام "بھوت محل" مشہور ہوگیا۔ تمام نوکر چاکر سب ڈر کے مارے نواب صاحب کی حویلی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کو بھی اُس حویلی میں ڈر لگنے لگا۔ وہ بھی حویلی خالی کر کے دوسرے شہر میں اپنے بھائی کے پاس چلے گئے اور اپنے ساتھ میاں چغد اور "بی رانی" کو بھی لے گئے۔ بھوت نے جب دیکھا کہ وہ لوگ سامان لے کر دوسرے شہر میں جا رہے ہیں۔ اُس نے سوچا میں اکیلا اس حویلی میں کیا کروں گا۔ وہ بھی جلدی ایک صندوق میں چھپ گیا اور ان کے ساتھ وہ بھی دوسرے شہر چل دیا۔ آخر یہ سب لوگ دوسرے شہر میں پہنچ گئے۔ نواب صاحب، بیگم صاحبہ رانی اور چغد بھی اُن کے ساتھ نواب صاحب کے بھائی کے گھر چلے گئے۔ "بی رانی" تو بیگم صاحبہ کے پلنگ کے نیچے بیٹھ گئی۔ "میاں چغد" نے کمرے میں چاروں طرف دیکھنا شروع کیا کہ وہ کہاں بیٹھے۔ آخر بڑی تلاش کے بعد اُن کی نظر دیوار کی کھونٹی پر پڑی۔ بس وہ جلدی سے کُود کر کھونٹی پر جا بیٹھے اور لگے اونگھنے۔ آخر بھوت بھی صندوق میں سے نکلا، اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ٹھیرے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک کونے میں جا بیٹھا۔ رات ہوئی۔ سب سونے کو لیٹے۔ بھوت کو شرارت سوجھی۔ اُس نے وہی پُرانی شرارت شروع کر دی، دروازہ کھولا بند کیا اور چُوں، چُوں، کھٹ پٹ شروع کر دی۔ میاں چغد اور بی رانی نے آواز سُنی۔ وہ دونوں بھاگے بھاگے بھوت کے پاس گئے، اُس کو سمجھایا، "اگر تم یہ شرارت نہیں چھوڑ دگے تو ہماری تمھاری دوستی ختم ہو جائے گی۔ تمھاری شرارت نے دَر دَر کی ٹھوکریں کھلائیں ہیں۔ اب یہاں سے ہم کہاں جائیں گے۔" بھوت نے اُن سے وعدہ کر لیا کہ اب میں شرارت نہیں کروں گا اور چپکے سے سو گیا۔ کئی دن گزر گئے۔ سب لوگ امن و امان سے رہنے لگے۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اُس گھر کے ملازم کی نظر اُس کھونٹی پر پڑی، جہاں "چغد میاں" بیٹھے تھے۔ وہ دَوڑتا ہوا خانساماں کے پاس گیا۔ خانساماں نے میاں چغد کو دیکھا، اُس نے گھر کے مالک کو بتایا۔ گھر کا مالک چغد کو دیکھ کر بہت حیران تھا۔ چُغد یہاں کیسے آیا، مگر وہ بڑے مزے سے سو رہے

تھے۔ مالک نے گھبرا کر پولس کو خبر کی۔ سپاہی آیا اور میاں چُغد کو پکڑ کر "چڑیا گھر" لے جا کر چھوڑ آیا۔ "بی رانی" اور "بھوت" نے جو دیکھا کہ ہمارا ساتھی پکڑا گیا ہے، اس وقت وہ قید میں ہے، اس کی مدد کرنی چاہیے، تو وہ دونوں بھاگے بھاگے چڑیا گھر پہنچے اور سوچنے لگے کہ "میاں چغد" کو کسی طرح چُھڑا لائیں۔ میاں چغد لوہے کے پنجرے میں بند تھے۔ وہ دونوں چُپ چاپ ایک طرف بیٹھ گئے اور اپنے دوست کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ اتنے میں چڑیا گھر کا چوکیدار آیا، اُس نے لوہے کے پنجرے کا قفل کھولا اور میاں چغد کو کھانے کے لیے چنے ڈالنے لگا۔ اتنے میں بھوت نے دَوڑ کر چوکیدار کا دامن پکڑ لیا۔ بی رانی نے کُود کر اُس کی گردن پکڑ لی۔ چوکیدار بہت گھبرایا اور چیخنے لگا، "لوگو! مجھے بچاؤ!" میاں چغد موقع پا کر پھڑ پھڑ کر کے اُڑے اور پنجرے سے نکل گئے۔ اُس کے بعد بی رانی اور بھوت نے چوکیدار کو چھوڑ دیا۔ تینوں دوست کُودتے اُچھلتے خوش خوش وہاں سے نکل کر گھر پہنچے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کو خبر بھی نہ ہوئی کہ ان کے چغد پر کیا گزری۔ آخر ایک دن باتوں باتوں میں ان کے بھائی نے باورچی خانے کے اُلّو کا ذکر کیا، اس پر نواب صاحب اور بیگم صاحبہ نے



بتایا کہ یہ تو ہمارے چغد میاں ہیں۔ ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ سُن کر اُن کے بھائی اور بھاوج بہت ہنسے اور کہنے لگے، "بھائی صاحب، بھلا یہ جانور بھی کہیں پالنے کے قابل ہے۔ یہ تو بے حد سُست، کاہل اور بے کار ہے۔ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی رات دن سُستی اور کاہلی سے بیٹھا اونگھتا رہے اور کوئی کام کاج نہ کرے تو اس کی مثال دیتے ہیں کہ یہ بالکل اُلّو کی طرح ہے، اسی وجہ سے تو لوگ اسے منحوس سمجھتے ہیں۔ شاید آپ کی حویلی میں اسی کی نحوست کا بھوت ہوگا۔ اسے نکالیے، حویلی پاک ہوجائے گی۔"

نواب صاحب کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اُنھوں نے فوراً اُلّو کو چھوڑ کر اپنے شہر جانے کا ارادہ کرلیا۔ بلّی مسکین اور خاموش تھی، اُسے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ آخر ایک دن اُن کا تمام سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ یہ دیکھ کر چغد میاں کو پتہ چلا کہ میرے مالک اپنے گھر واپس جارہے ہیں اور ان کو نہیں لے جائیں گے۔ آخر وہ بھوت کے ساتھ گھر کی سیڑھیوں میں چپکے چپکے جا بیٹھے اور سوچنے لگے کہ کیا ترکیب کریں۔ بھوت کو شرارت سوجھی اُس نے عجیب عجیب آوازیں نکالنی شروع کردیں۔ سب لوگ خوف سے کانپنے لگے۔ نواب صاحب کے بھائی نے پولس کو ٹیلیفون کرکے بلایا۔ پولس نے چاروں طرف دیکھ بھال کی۔ اتنے میں بھوت بھاگتا بھاگتا اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ چغد بھی ساتھ تھا۔ ریل گاڑی چل پڑی تھی۔ بھوت نے جلدی سے آگے بڑھ کر انجن کو روکنا چاہا۔ انجن بھک بھک دھوئیں کے بادل چھوڑتا ہوا آگے نکل گیا۔ بھوت کی آنکھوں میں دھواں بھر گیا اور وہ گر پڑا۔ لوگوں نے اُسے دیکھ کر چلّانا شروع کیا، بھوت، بھوت! اور بھوت سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگا کہ کہیں لوگ مجھے پکڑ نہ لیں۔ میاں چغد بھی بھاگ کر کہیں چھپ گئے۔ بی رانی دونوں سے اس لیے ناراض ہوگئی کہ اُن کی شرارت کی وجہ سے ہمارے مالک پریشان ہوئے۔ اب ان سے دوستی نہیں کرنی چاہیے۔ نواب صاحب، بیگم صاحبہ شہر واپس پہنچ کر اپنی حویلی میں چین آرام سے رہنے لگے اور حویلی کا بھوت ہمیشہ کے لیے بھاگ گیا۔ کہتے ہیں اس دن سے بھوت آدمیوں سے ڈرتا ہے اور سامنے نہیں آتا۔ اُلّو دن بھر جنگل کے درختوں میں چھپ کر سوتا رہتا ہے اور رات کو ادھر اُدھر گھومتا ہے۔ اس کی سُستی اور کاہلی کی وجہ سے اسے کوئی نہیں پالتا۔ بلّی گھروں میں بغیر کرسی، پلنگ اور الماری کے نیچے دبکی بیٹھی رہتی ہے کہ کسی کے ساتھ شرارت میں شریک نہ ہونا پڑے، لوگ سمجھیں کہ یہ بے چاری بڑی مسکین ہے، شرارت نہیں کرتی، لیکن وہ چُپکے چُپکے چوہوں کو دبوچ لیتی ہے۔ تو بچو! اب بھوت انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور بھئی بُری باتوں کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہی ہوتا ہے۔



فرض

حبیب کیفوی

— کھیل میں حصّہ لینے والے —

نادر ----- عمر ۱۴ سال		
ناصر ----- عمر ۱۳ سال		ہم جماعت اور دوست
جمیل ----- عمر ۱۲ سال		

اکرم ----- عمر ۵ سال - قصبے کا ایک بچّہ

نادر کی امی اور ابّا

[نادر سونے کے کمرے میں پلنگ پر لحاف اوڑھے لیٹا ہوا ہے - اس کی امّی پلنگ کے ساتھ ہی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی اخبار پڑھ رہی ہے - نادر "اُف" کہہ کر لحاف اُتار پھینکتا ہے -]

ماں : کیوں بیٹا، کیا بات ہے ؟

نادر : کچھ نہیں امّی !

ماں : پھر لحاف کیوں اُتار پھینکا ہے ؟

نادر : لیٹنے کو جی نہیں چاہتا امّی !

ماں : (لحاف اوڑھاتے ہوئے) آرام سے لحاف میں لیٹے رہو - جسم کو گرم رکھنے کی ضرورت ہے - تمھارے ابّا باہر جاتے وقت بڑی تاکید کر گئے تھے اس بات کی -

نادر : لیکن میں تو بھلا چنگا ہوں امی! کل ذرا سردی لگی تھی اور اب تو بالکل ٹھیک ہوں -

ماں : خدا ایسا ہی کرے تم نہیں سمجھتے، سردیوں

ہیں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے ۔

نادر : بیمار تو ہوں نہیں۔ ابا جان اور آپ نے مجھے ناحق بستر پر لٹا دیا ہے ۔

ماں : بھئی سردیوں میں نہر کے برف کی طرح ٹھنڈے پانی سے ٹھنڈ لگ جانے کا خطرہ تھا۔

نادر : کوئی تکلیف تو معلوم نہیں ہوتی اب مجھے۔

ماں : مجھے پتہ ہے نا، جس طرح تم ٹھٹھرتے ہوئے کل گھر آئے تھے۔ کپڑوں سے پانی نچڑ رہا تھا اور تم سردی سے کانپ رہے تھے۔

نادر : وہ تو کل کی بات ہے امی! آج تو بالکل ٹھیک ہوں اور چل پھر سکتا ہوں ۔

ماں : اچھا تو چل پھر لینا بابا! اب تو لحاف میں پڑے رہو۔

نادر : اچھا! جیسی آپ کی مرضی ہو امّی!

ماں : ہاں بس اسی طرح لیٹے رہو۔

(نادر کی امّی کرسی پر بیٹھ کر پھر اخبار اٹھا کر دیکھنے لگتی ہیں کہ اتنے میں گھنٹی بجتی ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ باہر کون آیا ہے کھڑکی کھولتی ہے اور باہر جھانکتی ہے۔)

لو نادر! تمھارے دوست ناصر اور جمیل آئے ہیں۔ (بچّوں سے) ٹھیرو بچو! میں دروازہ کھولتی ہوں ۔

(دروازہ کھلتا ہے ۔ بچے خالہ جان آداب! خالہ جان آداب! کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہیں ۔)

نادر : (دوستوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) اوہ! ناصر اور جمیل ۔

ناصر : کیسے ہو اب نادر تم ؟

نادر : اچھا ہوں یار۔ دیکھتے ہو بیٹھا ہوا تو ہوں۔

جمیل : یہ تو بڑی اچھی بات ہے ۔

ناصر : ہم یہ ابھی باتیں کرتے آرہے تھے کہ پرسوں ماڈرن اسکول کے لڑکوں سے میچ ہے ۔ نادر میچ میں نہ کھیلا تو بڑی کرکری ہوگی۔

نادر : یہ کیوں بھلا ؟

ناصر : اس لیے کہ شاید تم کھیلنے کے قابل نہ ہو سکو۔

نادر : نہیں نہیں یار ایسی تو کوئی بات نہیں۔ یہ تو مجھے امّی اٹھنے نہیں دیتیں ورنہ آج ہی کھیلنے کے لیے جاتا۔

ناصر : بھئی خالہ جان تمھارے ہی بھلے کی بات کر رہی ہیں ۔

ماں : (ہنستے ہوئے) ذرا سُننا نادر کی بات کہ میں اُسے اُٹھنے نہیں دیتی ۔

نادر : امی آپ ناراض کیوں ہوتی ہیں۔ بھلا میں آپ کے حکم کے خلاف کر سکتا ہوں۔ یہ تو یوں ہی ناصر سے بات کر رہا ہوں (ہنستا ہے)۔

جمیل : توبہ ! نہر کا پانی جس میں ہاتھ ڈالیں تو
سُن ہو جائے اس میں کپڑوں سمیت کوُدنا
نادر ہی کا کام تھا خالہ جان !

ناصر : واقعی جس جس نے سنا حیران رہ گیا۔

جمیل : اور نادر کی بہادری کی تعریف بھی تو سب کر رہے ہیں۔

نادر : چھوڑو یار کیا بہادری ہے۔

ناصر : واہ ! بہادری کیوں نہیں ؟ تم نے اپنی جان پر کھیل کر اکرم کی جان بچائی ہے۔

نادر : میری جگہ اور کوئی ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا، جو میں نے کیا۔ یہ تو ہر ایک کا فرض ہے۔

ماں : ناصر بیٹے ! بات کس طرح ہوئی۔ نادر نے تو کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ بس یہ کہ اکرم نہر میں ڈبکیاں کھا رہا تھا اور اُس نے جا کر نکال لیا۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

ناصر : خالہ جان کتنے ہی لڑکے وہاں کھڑے تھے۔ اکرم اور ایک لڑکا نہر کے کنارے دَوڑ رہے تھے۔ اکرم کا پاؤں ایسا پھسلا کہ دھڑام سے نہر میں جا گرا اور ڈبکیاں کھانے لگا۔

ماں : اچھا!

ناصر : جی ! پانی کافی گہرا تھا، بچارا ڈوبنے لگا۔ سب لڑکوں نے اُسے ڈبکیاں کھاتے ہوئے دیکھا، پھر یک لخت دھڑام سے پانی میں کسی کے گرنے کی آواز آئی۔

ماں : ہوں۔

جمیل : دیکھا تو پانی میں کودنے والا نادر تھا۔



ماں : اچھا!

ناصر : اور دوسرے ہی لمحے اُس نے اکرم کو پکڑ لیا جو ڈوبنے ہی والا تھا اور غوطوں پر غوطے کھا رہا تھا۔

جمیل : اکرم کا دَم اُلٹ چکا تھا خالہ جان!

ناصر : دیکھتے ہی دیکھتے ناصر اکرم کو نہر سے نکال کر کنارے پر لے آیا۔

جمیل : اکرم اب بیہوش ہو چکا تھا۔ اِسے لڑکوں نے فوراً اس کے گھر پہنچا دیا اور جب اُس کے ماں باپ کو پتہ چلا کہ نادر نے اُسے ڈوبنے سے بچایا ہے تو وہ بڑے خوش ہوئے اور نادر کو دُعائیں دینے لگے۔

ناصر : پَل کی پَل میں یہ خبر سارے قصبے میں پھیل گئی۔

جمیل: ہمارے اسکول کے ماسٹروں نے سُنا تو وہ بھی بڑے خوش ہوئے۔

ناصر : پتہ ہے جمیل! ہیڈ ماسٹر صاحب کیا کہتے تھے؟

ماں : کیا کہتے تھے؟

ناصر : کہتے تھے کہ نادر نے بہادری کا کام کرکے ہمارے اسکول کی عزت بڑھا دی ہے اور ہم کو نادر پر بڑا فخر ہے۔

نادر : چھوڑو یار، ان باتوں کو۔ کوئی میچ کی بات کرو اور تم لے بیٹھے ہو نادر کی بہادری کا قصہ! گویا اس نے دلی فتح کرلی ہے۔

ماں : (خوشی کو ضبط کرتے ہوئے) یہ دلی فتح کرنے سے کم بات نہیں ہے میرے بیٹے! یہ تم اپنے ماں باپ کے دل سے پوچھو کہ وہ تمھاری اس انسانی خدمت سے کتنے خوش ہوئے ہیں اور اُنھیں اپنے بیٹے پر کتنا فخر ہے۔ خزانہ بھی مل جاتا تو اتنی خوشی نہ ہوتی ـــــــ شکر ہے خدایا تو نے ہمارے بچے کو یہ توفیق بخشی۔ اچھا جمیل بیٹے! کیا کہتے تھے اور ہیڈ ماسٹر صاحب؟

جمیل : جی! کہتے تھے ہم نادر کی بڑی سی تصویر بنا کر اسکول کے ہال میں لگائیں گے اور اُس کے نیچے موٹے لفظوں میں یہ عبارت لکھیں گے۔

ماں : کیا عبارت؟

جمیل: یہ کہ نادر ہمارے اسکول کا وہ قابلِ فخر طالب علم، جس نے اپنی جان کی بازی لگا کر ایک ڈوبتے ہوئے بچے کی جان بچائی۔

ماں : ہوں۔

ناصر : نادر کی بہادری واقعی اس قابل ہے کہ سارا اسکول اس پر فخر کرے۔

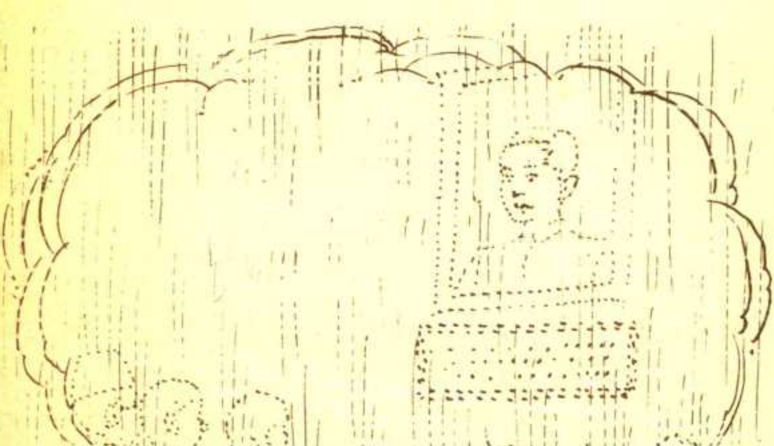
جمیل : بلکہ سارا قصبہ۔

نادر : چھوڑو گے بھی اس قصے کو یا اسے اخبار میں چھپوا کر ہی دم لو گے۔

ناصر : تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ واقعہ اخبار میں نہیں

ہو گیا۔

ماں : بیٹے عذاب کیسا؟ دُنیا میں جو لوگ دوسروں کی بھلائی کا کام کرتے ہیں یا مشکل میں کسی کے کام آتے ہیں، دُنیا والے اس کا چرچا کرتے ہیں اور کام کو قدر کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔



چھپے گا؟

جمیل : یقیناً اخبار والوں کو جب واقعہ کا علم ہوگا تو وہ فوٹو گرافر بھیج کر تمھارا فوٹو چھاپیں گے۔ اس سے ہمارے اسکول کی عزت بڑھے گی اور دُور دُور شہرت ہو گی۔

نادر : بڑی مشکل ہو گئی! کسی کی مدد کرنا بھی عذاب

نادر : مجھے تو امی، یہ ذرا بھی پسند نہیں کہ جو بات ہو گئی اب بار بار اس کا ذکر کیا جائے۔

ماں : لیکن یہ ایک اچھی بات ہے جو سنتا ہے وہ خوش ہوتا ہے اور تمھیں بھی اس کارنامے پر خوش ہونا چاہیے۔

نادر : خوش تو ہوں امّی ! اکرم کیسا پیارا بچہ ہے۔ اگر ڈوب جاتا تو اس کے ماں باپ کے دل پر کیا گزرتی۔ بس اس خیال نے مجھے نہر میں کودنے پر اُکسایا اور مجھے ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ پانی کتنا ٹھنڈا ہے۔

ماں : ہاں بیٹے ! نیکی کا خیال جب انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے تو پھر وہ کسی خطرے سے نہیں ڈرتا۔

نادر : لیکن امی ! اگر اکرم کو بچاتے بچاتے میں خود بھی ڈوب جاتا تو پھر بھی یہ فخر کی بات تھی ؟

ماں : کیوں نہیں۔ اوّل تو خدا ایسا نہ کرتا اور اگر ایسا ہو جاتا تو یہ بھی فخر کی بات تھی کہ ایک بہادر لڑکے نے کسی کی جان بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔ اسی طرح ملک کی خاطر جو لوگ اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں، اُن کا نام بھی ہمیشہ رہتا ہے اور اُن کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔

ناصر : خالہ جان نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ نادر معلوم نہیں، کیوں ایسی باتیں کر رہا ہے۔

نادر : یُوں ہی ہنس رہا ہوں یار۔ سچ مچ ڈوبنے کی بات نہیں کرتا اور یہ تو بتاؤ، اکرم کیسا ہے اب ؟

ناصر : ٹھیک ہے، کھیل رہا تھا۔

نادر : بڑا کھلنڈرا ہے وہ۔ شکر ہے کہ اس کی جان بچ گئی

اور ہاں تو پھر پرسوں میچ ہوگا !

ناصر : ہاں کیوں نہیں۔

نادر : تو کھیلیں گے پھر !

ناصر : ضرور ! اور سچی بات تو یہ ہے کہ تمھارے بغیر میچ کا مزا ہی نہیں۔

ماں : اوہ بیٹو ! معاف کرنا میں نے کھانے پینے کو تو تمھیں پوچھا ہی نہیں اور تو اس وقت کچھ موجود نہیں، کچھ مالٹے پڑے ہیں وہ لاتی ہوں۔ (جاتی ہے)

ناصر : نہیں خالہ جان ! بڑا شکریہ، اس وقت کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جمیل : جی ہاں ! تکلیف نہ کریں آپ !

ماں : اسکول سے سیدھے ادھر ہی تو آ رہے ہو۔

ناصر : جی ہاں۔

ماں : تو پھر ضرورت کیوں نہیں ؟

(مالٹے لیے ہوئے) یہ لو ! اٹھاؤ ناصر ! ارے تکلف کیوں کر رہے ہو۔ تم بھی نادر کی طرح اپنے بچے ہو۔ اپنے گھر میں بھی کوئی تکلف کی بات کرتا ہے۔ شاباش ! لو کھاؤ۔



ایک آٹھ سالہ بچے کا کارنامہ

مَیں تم سے مِل کر بہت خوش ہُوا ہوں!

لکھنے والے ـــــ ایرک ڈیوس
ترجمہ کرنے والے ـــــ محمد موسیٰ

لکڑی کا تختہ صرف چھ ۶ فیٹ لمبا اور تین فیٹ چوڑا تھا اور اس پر ہم تین آدمی سوار تھے۔ ایک انجینیر اپنے پھٹے ہوئے سر کے ساتھ، مَیں اور جیک کیلے۔ جیک لندن کے ایک غریب مزدور گھرانے کا لڑکا تھا۔

تختہ کسی لحاظ سے بھی آرام دہ نہ تھا، لیکن ہمارے لیے ڈوبتے جہاز سے بہتر تھا اور جب ایک جہاز صرف تیس ۳۰ منٹ میں غرق ہو سکتا ہے، جیساکہ ہمارے جہاز "بنارس" نے کر دکھایا تو کسی دوسری پسند کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔

تختے پر سب سے پہلے پہنچنے والا آدمی انجینیر تھا، جس کو ایک لہر بہاکر وہاں پہنچا آئی تھی، میں بعد میں اس وقت پہنچا، جب جہاز غرق ہو چکا تھا اور پھر ہم نے جیک کی آوازیں سُنیں اور اسے

بیس گز دُور ہاتھ پیر مارتے پایا۔ وہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پکڑے ہوئے تھا، جسم پر دو لائف جیکٹ تھے اور دوسرے کپڑے نہ ہونے کے برابر۔

جس رات ہمارا جہاز غرق ہوا، ایک بہت خوش گوار ہوا شمال سے آئی، سمندر جوش پر تھا اور پورا چاند نکلا ہوا تھا، گویا ایک خوش کُن ڈرامے کی ابتدا تھی، لیکن جو کچھ ہوا وہ ایک انتہائی ہولناک بات تھی۔ دس بجے رات کو جہاز پر تار پیڈو کا حملہ ہوا، اس وقت جہاز پر چار سو چھے مسافر سوار تھے، جن میں ایک سو بچے بھی شامل تھے، جو اپنے اپنے بستروں میں جا دبکے تھے۔ چوبیس گھنٹے بعد ایک سو اکسٹھ آدمی بچائے گئے، جن میں صرف اُنیس بچے تھے۔ باقی موت کی گود میں جا سوئے تھے۔

اگر آپ کو سمندر میں سے کسی کو تختے پر سوار کرانا ہے تو اسے تختے کے اوپر سے نہ کھینچیے، ورنہ تختہ اُلٹ جائے گا۔ جیک کو تختے پر اُٹھانے کے لیے میں خود سمندر میں کُودا اور اُس کو تختے پر دھکیل دیا اور اب سوچ ہی رہا تھا کہ میں خود کس طرح چڑھوں کہ جیک نے وہ ناقابلِ فراموش الفاظ کہے۔ اُس نے سردی سے بجتے ہوئے دانتوں کے درمیان کہا، "جناب ---- جناب ----" میں سمجھا شاید اس کا کوئی اور ساتھی سمندر میں ہے، چناں چہ میں نے دریافت کیا، "ہاں، ہاں کہو۔" تو کہنے لگا، "جناب، آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

تختہ سمندر کی سطح کے ساتھ لگا ہوا نہیں کہا جا سکتا تھا، کیوں کہ جو بھی لہر آتی تھی، تھپیڑے مارتی ہوئی اوپر سے گزرتی تھی۔ اس بپھرے ہوئے سمندر میں ہمارے تختے پر سے پھسلنے کا ہر وقت خدشہ رہتا تھا، خصوصاً جیک کے لیے بڑی مصیبت تھی۔ چناں چہ رات کے وقت ہم دونوں اس کے تقریباً اوپر ہو کر سوئے۔ اس میں ایک اور بھی فائدہ تھا کہ رات کی سرد ہوا سے جیک کافی حد تک محفوظ رہا۔

غذا بھی موجود تھی۔ ایک چھوٹے سے کپ بورڈ میں دودھ کے ٹین، جہاز کے بسکٹ اور ایک پانی کا ٹن اور ڈبہ کھولنے کا ایک اوزار بھی، لیکن کیا آپ نے کبھی صرف ایک ہاتھ کی مدد سے بیچ سمندر میں لکڑی کے ایک تختے پر بیس بیس فیٹ اونچی موجوں کے تھپیڑوں کے درمیان ٹین کا ڈبہ کھولنے کی کوشش کی ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہاتھ سے چار دودھ کے ڈبے تھپیڑوں کا نشانہ بن کر سمندر میں جا پڑے۔

ہمارے تبادلۂ خیالات کا وقت صرف

کھانا کھانے کے بعد ہوتا تھا اور سمندر کے درمیان میں وہاں باتیں کرنے کے لیے کون سا موضوع رہ جاتا ہے، سب جانتے ہیں، لیکن ہم اس سے بھی گریز کرتے تھے، البتہ جیک اپنے دودھ اور بسکٹ کے ناشتے کے بعد ضرور پوچھتا، "میں کہتا ہوں جناب ہم کس طرف جا رہے ہیں؟" "ہم؟" میں کہتا، "ہم شاید اُس طرف جا رہے ہیں - تم دیکھتے ہو، ہوا ہمیں وہیں دھکیل رہی ہے۔" "ٹھیک ہے" وہ سکون سے کہتا، "لیکن کون سی طرف؟" کیا ہم امریکا جا رہے ہیں یا واپس انگلستان؟"

ہر آدھ گھنٹے بعد ہمیں پھر سے اپنے آپ کو سنبھالنا پڑتا تھا، کیوں کہ ہم پھسلتے پھسلتے بالکل کنارے پر پہنچ جاتے تھے - دن کے وقت جبکہ گرمی تھی، جیک نے اور میں نے خود کو بہلانے کے لیے بسکٹ کے ٹکڑے سمندری پرندوں کو کھلائے، پھر جیک سو گیا اور میں بیٹھ کر دور افق پر دیکھنے لگا اور ہر بادل کے ٹکڑے کو دیکھ کر سوچتا کہ شاید یہ کسی جہاز کا دھواں ہو، لیکن وہاں کوئی جہاز نہ تھا، نہ آس پاس کوئی اور تختہ تھا، نہ جہاز کے ٹوٹے ہوئے ڈھانچے کا کوئی حصہ - ہاں! ایک طویل اور اُکتا دینے والا دن، لیکن جیک نے کبھی شکایت نہ کی -

اپنے اعضا کو گرم رکھنے کے لیے ہم نے انگلیوں، بازوؤں، پیر اور ٹانگوں کو ہلایا جُلایا، اینٹھن دُور کرنے کے لیے انگڑائیاں لیں اور بل کھائے - میں نے جیک کے ہاتھ پیروں کی مالش کی - جتنا زیادہ ہم نے اپنے آپ کو کام میں لگایا اتنا ہی کم وقت سوچنے کے لیے بچا، لیکن جب اُمید ختم ہو گئی تو ہم پر اُداسی چھا گئی اور ہم نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا، حتیٰ کہ سورج بھی ہم میں کوئی گرمی نہ لا سکا - ہم نے احتیاط برتنی چھوڑ دی اور اوندھے سیدھے لیٹ گئے - سوچتے رہے، خواب دیکھتے رہے -

انجینیر ضرور بے ہوش ہو گیا ہوگا - یہ سب اچانک ہوا اور کیسے ہوا، میں نہ جانتا تھا - جیک نے مجھے پکڑ کر ہلایا، "اُسے دیکھیے" - وہ چلّایا، "اُس کی طرف دیکھیے" کاہلی سے میں اس طرف مڑا اور دیکھا کہ انجینیر پھسل رہا تھا - وہ گر چکا ہوتا، اگر ہم نے اسے پکڑ نہ لیا ہوتا - ایک ایک انچ کر کے ہم نے اسے کھینچا اور آہستہ آہستہ اوپر لے آئے اور اطمینان کا سانس لیا - پانی کے چھینٹے دے کر اُسے ہوش میں لایا اور پھر ہم نے تختے پر لیٹنے کا نیا طریقہ وضع کیا - ہم نے اپنے ہاتھوں اور پیروں میں ایک دوسرے کو قینچی دے کر جکڑ لیا اور اس طرح لیٹے -

اس واقعہ نے جیک کو مکمل طور پر جگا دیا،

اس کی خاموشی اور اُداسی پن رخصت ہو گیا اور وہ خوب باتیں کرنے لگا۔ سورج ڈوب رہا تھا اور ڈوبتے سورج سے ملاقات کرنے کے لیے ایک تند و تیز طوفان آ رہا تھا۔ سمندری عقاب اور پرندے کہیں نظر نہ آتے تھے۔ ہوا تیز ہو رہی تھی اور سمندر جوش میں آ رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شام ہونے سے پہلے ہمیں دودھ کا راشن استعمال نہ کرنا چاہیے کیوں کہ ہمارے پاس صرف ایک ٹن رہ گیا تھا۔

جس وقت جنگی جہاز نے ہمیں تین میل دُور سے دیکھا اور سیٹیاں دیں تو میں نے انھیں نظر انداز کر دیا۔ میں پہلے بھی کئی جہازوں کی سیٹیاں سُن رہا تھا اور خصوصاً شام سے جب کہ اندھیرا بڑھ رہا تھا، میں سمجھ چکا تھا کہ یہ میرا واہمہ ہے اور یہ آواز موجوں کے تھپیڑوں کی ہے۔ انجینیر تاہم اُٹھ بیٹھا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ اگر آدمیوں نے یہ آواز سُنی ہے تو ہو سکتا ہے کہ شاید ...... شاید......

اور یہ بات اس وقت پایۂ ثبوت کو پہنچی جب ہم ایک ایسی بلند لہر پر آ گئے، جس نے ہمیں اتنا اونچا اُٹھایا کہ ہم نے جہاز کو دیکھ لیا، جس کا کہ پچھلا حصہ ہماری طرف تھا۔ ہم خوشی کے مارے چلانے اور شور مچانے لگے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہماری آوازیں وہاں تک نہیں پہنچ رہی ہیں۔ اچانک جہاز نے رُخ موڑا اور ہماری طرف پوری رفتار سے آیا، چناں چہ

اب ہم خاموش تھے، سردی کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ جہاز ہمارے قریب آ کر رُکا۔ ایک رسّی پھینکی گئی، جس کو ہم نے پکڑ لیا اور جیک کو اُس کے پیروں پر سے اُٹھا لیا، وہ خود کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ جُوں ہی ہم نے اُسے عرشے کی سطح تک پہنچایا، جہاز والوں نے اسے پکڑ لیا اور عرشے پر اُتار دیا۔ اچانک تختے کا توازن بگڑا اور ہم دونوں سمندر میں گر کر بوتل کی ڈاٹ کی طرح ڈبکیاں کھانے لگے اور پھر ہمیں معلوم ہوا کہ عین سمندر میں کسی جہاز پر چڑھنا مشکل ہے بہ نسبت اُترنے کے۔ دھوئیں سے بھرے ہوئے انجن روم میں ایک ملاح نے ہمارے گیلے کپڑے اُتارے اور دوسرا میرے اور جیک کے لیے گرم گرم دودھ لے آیا۔ انجینیر کو بستر پر پہنچا دیا گیا تھا اور میں اور جیک ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بے وقوفوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔ اس وقت بھی جیک کے دانت بج رہے تھے۔ وہ ذرا بھی تو نہ رو دیا۔ نہ اپنے گھر کے بارے میں کوئی بات کی اور نہ اپنی بہن کے بارے میں، جس کے متعلق بعد میں معلوم ہوا کہ "بنارس" کے ساتھ نذرِ آب ہو چکی تھی۔ ایک رات پہلے اُس نے اپنی عقل مندی سے خود کی جان بچائی اور دوسرے دن انجینیر کی۔ اس نے صبر اور ضبط کا بہترین مظاہرہ کیا اور ایک دفعہ بھی اُمید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، وہ ہنسی خوشی لندن کو چلا، جہاں کہ رات دن بمباری ہو رہی تھی۔ بہت بڑا کارنامہ تھا، ایک آٹھ سال کے بچّے کے لیے۔ "جیک کیلے! میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔"



فلم کیسے بنائی جاتی ہے؟

علی ناصر زیدی

فلم سازی میں سیلولوز نائٹریٹ نامی مادہ زیادہ تر بنیادی عنصر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مادہ آگ تیزی سے پکڑتا ہے۔ دوسرا بنیادی جزو سیلولوز ایسی ٹیٹ ہے، جو اتنا تیز نہیں ہوتا۔ وہ آسانی سے آگ بھی نہیں پکڑتا اور معمولی فلموں کی تیاری کے لیے مناسب رہتا ہے۔

سیلولوز چھوٹے چھوٹے ریشوں کی شکل میں ہوتی ہے، جو بنولوں کے ڈوڈوں سے بڑے ریشے نکالنے کے بعد حاصل کیے جاتے ہیں۔ انھیں مشینوں کے ذریعے صاف کیا جاتا ہے اور روئی کا رنگ کاٹ دیا جاتا ہے۔ آخری بار خشک کرنے سے پہلے انھیں کئی مختلف طریقوں سے دھویا جاتا ہے۔ اس روئی کو سیلولوز نائٹریٹ یا سیلولوز ایسی ٹیٹ کی شکل میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اس کام میں کئی ترشے استعمال کیے جاتے ہیں۔

سیلولوز نائٹریٹ میں شورے کا ترشہ کافی مقدار میں پانی پیدا کر دیتا ہے۔ اس پانی کو جذب کرنے کے لیے گندھک کا تیزاب شامل کیا جاتا ہے۔ سیلولوز کو مستقل طور پر حرکت دی جاتی ہے تاکہ اس کا ہر جزو مساوی طور پر ترشے سے مس ہو سکے۔ تیزاب میں تقریباً بیس منٹ گزارنے کے بعد دھونے اور صاف کرنے کا عمل پھر شروع ہوتا ہے۔ کچھ پانی قوت کے ساتھ باہر نکال دیا جاتا ہے اور سب مادہ جمع کر لیا جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ کچھ نم دار رہتا ہے۔

سیلولوز ایسی ٹیٹ میں شورے کے تیزاب کی بجائے سرکے کا تیزاب استعمال کیا جاتا ہے چوں کہ

سیلولوز ایسی ٹیٹ آگ نہیں پکڑتا، اس لیے وہ خشک حالت میں آسانی سے جمع کیا جاسکتا ہے۔

سیلولوز کو تحلیل کرنے کے لیے میتھیل الکحل، ایتھیل الکحل، ایتھر اور ایسی ٹون وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک اور جزو کا اضافہ کیا جاتا ہے، تاکہ تیار شدہ کچی فلم میں کافی لچک پیدا ہو جائے۔ یہ ایک روغن ہوتا ہے، جسے "ڈوپ" کہتے ہیں۔

استعمال سے پہلے ڈوپ کو اچھی طرح چھان لیا جاتا ہے، تاکہ وہ ہر طرح کے ذرات سے صاف ہو جائے۔ اس روغن کی ایک پتلی تہہ چکنی سطح پر چڑھادی جاتی ہے جس میں سے کچھ روغن تو خشک ہو جاتا ہے اور باقی چھیل کر صاف کر دیا جاتا ہے۔ سینما کی فلم کی لمبائی آسانی کے لیے ایک ہزار فیٹ رکھی جاتی ہے۔

کچی فلم تیار ہونے کے بعد اُس پر حساس مادّہ چڑھانے کی باری آتی ہے، لیکن اس کام سے پہلے اُس پر ایک اور تہہ چڑھائی جاتی ہے، جو چند کیمیائی خصوصیات رکھتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ حسّاس مادّے کو فلم پر مضبوطی سے بچھادے اور بعد میں بھی اُسے علیحدہ نہ ہونے دے۔

حسّاس مادّہ جو شیرے جیسا ہوتا ہے، اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ روشنی سے متاثر ہو جائے۔ زیادہ روشنی سے زیادہ اور کم روشنی سے کم۔ اگرچہ اس قسم کے بہت سے مادّے بازار میں ملتے ہیں، لیکن جو چیز عام طور سے اس کام کے لیے استعمال ہوتی ہے، وہ "سلور بروما ئڈ" ہے۔ یہ قلمی ٹکڑوں کی شکل میں ملتا ہے، اس لیے کچی فلم پر اُسے چپکانے کے لیے ایک اور چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس مقصد کے لیے جلیٹین استعمال کی جاتی ہے۔

آخر میں فلم ایک چرخی پر لپیٹ لی جاتی ہے۔ برقی چنگاریوں سے بچانے کے لیے خاص احتیاط عمل میں لائی جاتی ہے۔ کیوں کہ ایک ہی چنگاری فلم کو دُھندلا کرنے اور دوسری خرابیاں پیدا کرنے کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ فلم کو سُکھاتے وقت یہ تک دیکھا جاتا ہے کہ ہوا زیادہ خشک تو نہیں۔ ساتھ ساتھ فلم کو نمی اور رطوبت سے بھی بچایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر فلم کو صحیح طریقے سے خشک نہ کیا جائے تو اسٹور کرتے وقت اُس کے خراب ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

یہ سب کچھ ہو جانے پر ایک مشین کے ذریعے فلم کے چوڑے چوڑے رول چھوٹی چھوٹی پٹیوں میں تقسیم کر لیے جاتے ہیں۔ کاٹتے وقت فلم کو اچھی طرح سے دیکھا جاتا ہے۔ معمولی کیمروں میں استعمال ہونے والی فلم کی لمبائی نسبتاً کم ہوتی ہے۔ سینما میں جو فلم استعمال کی جاتی ہے وہ ایک مشین میں سے گزرتی ہے، جس کے ذریعے اُس کے کناروں پر سوراخ کر دیے جاتے ہیں، تاکہ وہ پروجیکٹر پر آسانی سے چل سکے۔

اخبار نونہال

محمّد منیر نے ساڑھے تیرہ سال کی عمر میں بی۔اے کر لیا

منیر جیسے طلبا پاکستان کے لیے قابل فخر ہیں

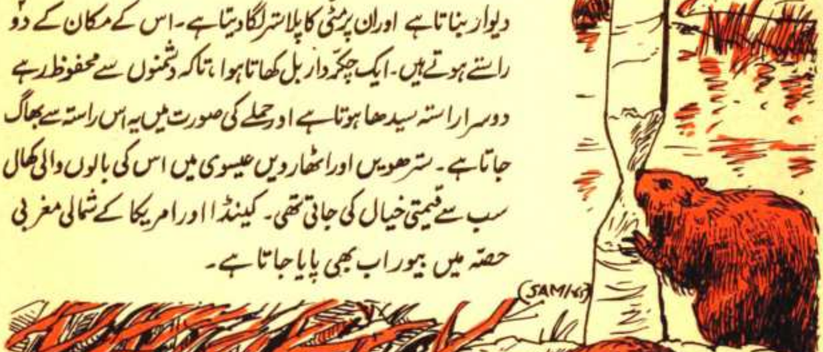
لائل پور - ساڑھے تیرہ سالہ محمد منیر نے اس سال بی۔اے کا امتحان پاس کر کے دنیا کا ریکارڈ توڑ دیا۔ اس سے پہلے ایک انگریز لارڈ ولزلے نے چودہ سال کی عمر میں بی۔اے کر کے ریکارڈ قائم کیا تھا۔ لارڈ ولزلے بعد میں انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم کا وزیر اعظم بنا

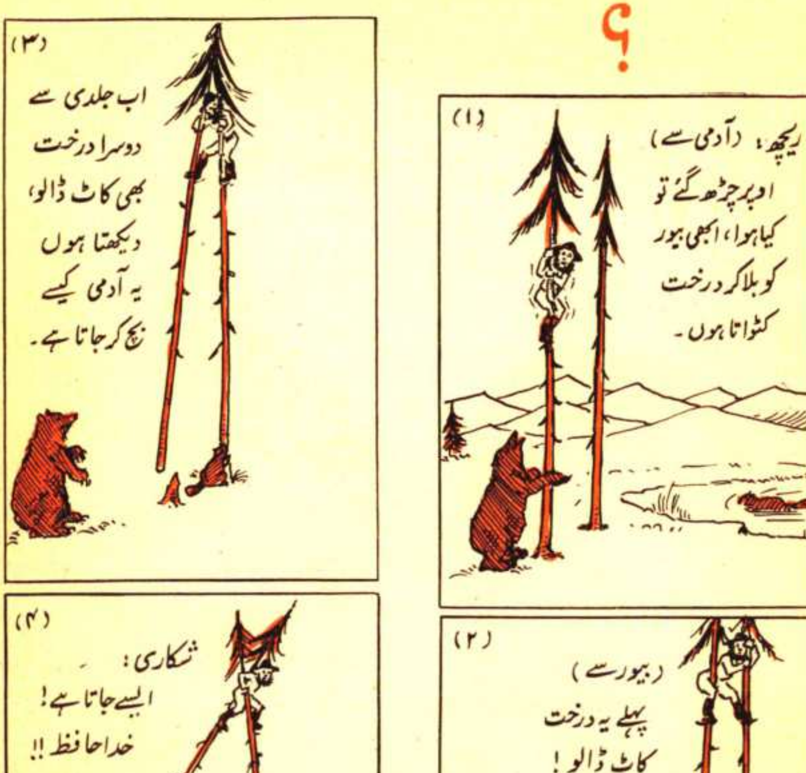
محمد منیر ننکانہ صاحب کے قریبی گاؤں چک نمبر ۵۶۰ تحصیل جڑانوالہ ضلع لائل پور کا رہنے والا ہے۔ اس کے باپ ملک غلام احمد پرائمری اسکول کے ٹیچر ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں محمد منیر نو سال کا تھا تو اس نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ جب کمرۂ امتحان میں داخل ہونے لگا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اسے روک کر پوچھا کہ وہ کیا لینے آیا ہے؛ منیر نے بتایا کہ وہ منشی فاضل کا امتحان دینے آیا ہے تو انھیں یقین نہیں آیا۔ امتحان میں منیر کی کامیابی سے علاقہ کے سارے لوگ حیرت میں پڑ گئے، ثانوی تعلیمی بورڈ کے سابق چیرمین تاج محمد خیال مرحوم نے منیر کو اپنے پاس بلا کر خود اس کا دوبارہ امتحان لیا اور وہ اس کی ذہانت اور صلاحیت سے بے حد خوش ہوئے اور اسے اپنی طرف سے خاص تمغہ دیا۔ اس کے بعد محمد منیر نے پرائیوٹ امتحان دے کر میٹرک پاس کیا اور پھر اسی طرح ایف اے پاس کیا تھا۔



بیور — جو درخت کو دانتوں سے کاٹ ڈالتا ہے

بیور (BEAVER) بہت ہی ہوشیار اور محنتی جانور ہوتا ہے۔ اس کا تعلق دانتوں سے کترنے والے جانور کے خاندان سے ہے اور یہ اس خاندان کا سب سے بڑا ممبر ہے۔ اس کا وزن ۳۵ پونڈ سے لے کر ۷۵ پونڈ تک ہوتا ہے۔ ناک سے لے کر دم کی جڑ تک یہ دو فیٹ ہوتا ہے اور ایک فٹ کی دُم ہوتی ہے۔ اس کے سامنے کے دانت چھینی جیسے تیز اور چوڑے ہوتے ہیں اور پیر بھی بطخ کی طرح، تاکہ وہ آسانی سے تیر سکے۔ یہ جانور بہترین تیراک اور غوطہ خور ہوتا ہے۔ دو منٹ تک پانی کے اندر رہ سکتا ہے۔ بیور درخت کاٹنے کا بڑا ماہر ہوتا ہے۔ اٹھارہ انچ قطر (DIAMETER) کے درخت کو آسانی سے کاٹ کر گرا دیتا ہے۔ بعد میں اس کی شاخیں کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیتا ہے، تاکہ اپنے رہنے کا مکان جو گنبد نما ہوتا ہے، بنا سکے۔ لکڑی کے ٹکڑوں کو گھاس اور کائی کے ساتھ ملا کر دیوار بناتا ہے اور ان پر مٹی کا پلاسٹر لگا دیتا ہے۔ اس کے مکان کے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک چکر دار بل کھاتا ہوا، تاکہ دشمنوں سے محفوظ رہے دوسرا راستہ سیدھا ہوتا ہے اور حملے کی صورت میں یہ اس راستہ سے بھاگ جاتا ہے۔ سترھویں اور اٹھارویں عیسوی میں اس کی بالوں والی کھال سب سے قیمتی خیال کی جاتی تھی۔ کینیڈا اور امریکا کے شمالی مغربی حصّہ میں بیور اب بھی پایا جاتا ہے۔





اس کارٹون کا عنوان اُردو کا ایک مشہور محاورہ ہے، بتاؤ وہ کیا ہے؟ صحیح عنوان لکھنے والے کو ایک کتاب انعام میں دی جائے گی۔ ایک سے زیادہ صحیح عنوان آنے کی صورت میں انعام پانے والے نونہال کا نام قرعہ سے نکال لیا جائے گا۔

سائنس ایک دل چسپ مشغلہ ہے

غائب ہونے والا خرگوش





اس خرگوش کو غائب کرنے کے لیے آپ کا جادوگر ہونا ضروری نہیں۔ یہ سادہ سا تجربہ ثابت کردیگا کہ اسے سائنس کی مدد سے کیسے غائب کیا جا سکتا ہے۔

یہ تجربہ تم کو بتائے گا کہ روشنی جب پانی سے گزر کر ہوا میں داخل ہوتی ہے تو کیسے منعطف ہوتی ہے۔

تمھارا سامان: ایک شیشے کا گلاس، ایک پلیٹ، خرگوش کی تصویر، جو اس صفحے کے اوپر بنی ہے۔

اب یوں کرو کہ اس رسالے کا یہ تصویر والا صفحہ کھولو اور اسے میز پر پھیلا دو۔ گلاس پانی سے بھر دو اور اسے پلیٹ سے ڈھک دو، پھر گلاس کو عین اس دائرے کے اوپر رکھ دو، جس پر خرگوش کی تصویر ہے۔

تم دیکھو گے کہ فوراً خرگوش کی تصویر تمھاری نگاہوں سے بالکل غائب ہوجائے گی، حتیٰ کہ پھر تم چاہے کسی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرو مطلقاً دکھائی نہیں دے گی۔

ایسا کیوں کر ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ روشنی کی کرنوں کا مڑنا "عمل انعطاف" ہے، یعنی وہ کسی ایک ذریعے سے دوسرے ذریعے تک گزرتی ہیں تو ایک "زاویہ" بنا کر گزرتی ہیں۔ اس حالت میں دو ذریعے پانی اور ہوا ہیں۔ جب کرنیں خرگوش کی تصویر سے شیشے کے گلاس کی طرف گزرتی ہیں تو وہ منعطف ہوجاتی ہیں یا اوپر کو جھک جاتی ہیں، جیسا کہ اس تصویر سے ظاہر ہے اور پلیٹ انھیں شیشے کے گلاس کے پردے سے کافی دور ہٹا دیتی ہے، اس لیے خرگوش کو دیکھنا کسی طور پر بھی ممکن نہیں رہتا۔



صحت مند نونہال



رخسانہ حنیف، کراچی



یوسف جمال خالد، کراچی



سلیم پپو - کراچی



اصغر احمد - سلہٹ



اقبال بن شاد ۔ ٹنڈو محمد خاں



ساجدہ ۔ کراچی



عتیق جاوید ٹلو میاں ۔ کراچی



زہرہ بتول عرف پنکی ۔ کراچی



چھنو اور منو ، صادق آباد

پسّو سرکس دکھاتے ہیں

ہاتھیوں، شیروں اور گھوڑوں کے سرکس تو شاید سب ہی نے دیکھے ہوں گے، لیکن پسوّوں کا سرکس تو شاید ہی کسی نے دیکھا یا اس کا تصوّر بھی کیا ہو۔ اس وقت پسوّوں کا سرکس کرنے والا دنیا کا واحد شخص برمنگھم (لندن) میں رہتا ہے۔ اسے اس پیشے میں ابھی تک نہ تو شہرت ملی ہے اور نہ دولت، لیکن اس نے جس انوکھے کھیل کی ابتدا کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند ہی دنوں بعد اسے دونوں چیزیں مِل جائیں گی۔

پچاس سالہ مسٹر لیونارڈ ٹاملن کے پاس بارہ موٹے تازے پسّو ہیں، جنھیں وہ سرکس میں استعمال کرتا ہے وہ چند روز بعد اپنے پسوّوں کے ساتھ نیویارک منتقل ہو رہا ہے۔ لیونارڈ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ساحلی علاقوں میں میں نے روزانہ ایک سو پونڈ بھی کمائے ہیں، لیکن امریکا میں اس سے کہیں زیادہ کماؤں گا۔

لیونارڈ کا چودہ سالہ لڑکا کرِس بھی اپنے باپ کے ہمراہ نیویارک جا رہا ہے۔ ایک ماہ بعد اس کی بیوی بھی امریکا روانہ ہوگی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ نہ جاسکے گی، کیوں کہ اس کے ہاں ۴ روز قبل جڑواں بچّے ہوئے ہیں۔



مجھے پہچانو، میں عفیفہ ہوں

لیونارڈ ۳۰ برس تک پسّوؤں کا سرکس چلاتے رہے ہیں اور یہ پیشہ انھیں آبا و اجداد سے ورثے میں ملا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آج کل پسّو حاصِل کرنا بڑا دشوار کام ہے۔

لیونارڈ نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا کہ مجھے ایک درجن پسّو حاصِل کرنے کے لیے ایک پونڈ دینا پڑتا ہے اور یہ پسّو بمشکل چودہ روز تک زندہ رہتے ہیں لیونارڈ کے بازوؤں پر سُرخ نشان جابجا نظر آتے ہیں، لوگوں کے سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ میں ان پسّوؤں کو دن میں تین بار اپنے بازوؤں کا خون پلاتا ہوں۔

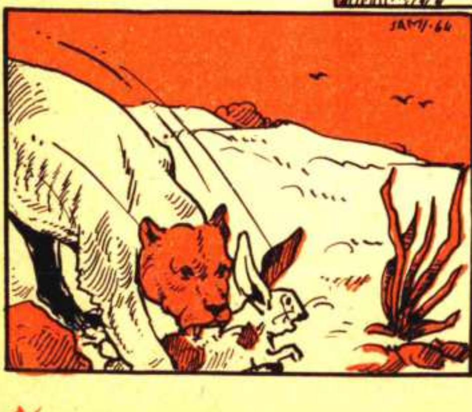
شیر ببر، جو افریقی جنگل کا بادشاہ تھا



راستے میں رینو سوچتا رہا کہ اب نئی جگہ پر بھی اس کو ارنے بھینسے، گینڈے، ہاتھی وغیرہ سے نمٹنا ہوگا اور یہ سب شیر کے دشمن ہوتے ہیں بمشکل سے قابو میں آتے ہیں۔ ان سے مقابلہ بڑا سخت رہتا ہے

ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ بیبوں بندروں سے بھی مقابلہ ضرور ہوگا، مگر تمام خطرے اس ایک خیال میں گم ہو جاتے تھے کہ اب وہ نئے جنگل کا بادشاہ ہوگا اور اس کی ملکہ ہوگی۔





کبھی کبھی راستے میں ایسا بھی ہوا کہ کوئی بڑا شکار نہیں ملا اور رینو اور شیرنی کو صرف معمولی خرگوش کے شکار پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔



جیسے جیسے رینو آگے بڑھتا گیا۔ اس کو کافی شکار نظر آتا گیا اور ہرن، زیبرے، ارنا بھینسے اور دوسرے جانور کافی تعداد میں دکھائی دینے لگے۔



رینو نے دیکھا کہ درخت پر ایک ببوں بیٹھا غور سے رینو اور اس کی ملکہ کو دیکھ رہا ہے اور اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر ہوشیار کر رہا ہے۔



ایک چیتا بھی اس درخت پر اس ببوں کی تاک میں بیٹھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چیتے نے چھلانگ لگا کر ببوں کو آن دبوچا۔ دونوں زمین پر گر پڑے۔ ببوں کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھا کر چیتا اس کو لے بھاگا۔



اس کی آواز سے تمام ببونوں نے جنگل کو سر پر اٹھالیا اور وہ سب اس طرف جھپٹے جدھر سے آواز آئی تھی، مگر وہاں سوائے رینو اور اس کی ملکہ کے انھیں کچھ نظر نہیں آیا۔



ببون شیر اور چیتے کے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔ رینو کی ملکہ کو دیکھتے ہی ببون اس سے لپٹ گئے۔ وہ سمجھے کہ اس ہی نے ان کے ساتھی کو کھایا ہے، اور اس غریب کو قریب بےبس کردیا۔



رینو مدد کو پہنچا تو اس کے بھی ببون چمٹ گئے اور خوب لڑائی شروع ہوئی۔ شور و غل سے جنگل میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ قیامت کا منظر تھا۔



آگے گھنے جنگل میں ہاتھیوں کے غول نے جو یہ شور و غل سنا تو وہ بے تحاشا بھاگے۔ ایک طوفان برپا ہو گیا۔ پھر کیا تھا، ببوں گھبرا کر شیر اور شیرنی کو چھوڑ بھاگے اور پاس ہی درختوں پر چڑھ گئے اور اس طرح ایک دشمن نے دوسرے دشمن سے رینو کی جان بچائی۔



رینو اور شیرنی موقع پا کر جنگل کی طرف بھاگ گئے۔ وہاں خوب شکار کیا اور نئی ملکہ نے اپنے نئے بادشاہ کو اچھی غذا دے کر دوبارہ طاقت ور بنا دیا، اور وہ تمام جنگل پر چھا گیا۔



بیتے دن پھر لوٹ آئے۔ رینو دوبارہ جنگل کا بادشاہ تھا۔ اس کی نئی ملکہ اور دو شہزادے اس کے ساتھ تھے اور اب رینو اسی شان سے اس جنگل میں رہنے لگا، جس طرح وہ پہلے رہتا تھا۔

(ختم ہوئی)

صحت کے لیے

اِن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے

سمیع آرٹسٹ

برف کے گولے، آئس کریم، پھل اور ایسی چیزیں جن میں کسی دوسرے کے دانت یا منہ لگ جائے صحت کے لیے نقصان دہ ہیں ۔





چھینک آتے وقت منہ اور ناک پر رُومال رکھو اور پھر چھینکو۔ زکام کی حالت میں بھی رُومال استعمال کرو۔



سڑک کے کنارے رکھے ہوئے
گندے برتنوں کا پانی کبھی نہ پیو۔
گندے لوگ اور بیمار سب ہی اُس
گلاس سے پانی پیتے ہیں، جو ایک
زنگ آلود زنجیر سے بندھا رہتا ہے۔



ٹھیلے والوں سے برف کے
گولے خرید کر نہ کھاؤ۔ ان میں جو شربت
ڈالا جاتا ہے، وہ نقصان دہ رنگوں
سے بنایا جاتا ہے۔ یہ صحت کے لیے
مضر ہوتا ہے اور یہ شربت روح افزا
نہیں ہوتا۔

جگہ جگہ
تھوکنے اور ناک صاف کرنے کی
عادت اچھی نہیں ہے ۔ دیوار، فرش
اور فٹ پاتھ پر کبھی نہ تھوکو۔ اسی طرح
ناک صاف کر کے دیوار سے ہاتھ نہ
پونچھو۔





بعض بچوں میں
یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ کتابوں کے
ورق انگلی میں لب (تھوک) لگاکر
اُلٹتے ہیں۔ یہ بھی ایک گھناؤنی عادت
ہے ۔ اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔



اپنا تولیہ
ہمیشہ الگ رکھو۔ کسی دوسرے
کے تولیے سے منہ صاف نہ کرو۔
اس سے بیمار ہونے کا اندیشہ
ہوتا ہے۔



چاٹ بیچنے والوں سے
چاٹ لے کر نہ کھاؤ۔ گلے سڑے پھل
نہ کھاؤ۔ وہ چیزیں بھی نہ کھاؤ، جو
کھلی ہوئی رکھی ہوں اور جن پر مکھیاں
بھنک رہی ہوں۔



ایک انچی لڑکا

سہیل احمد

بہت دن کی بات ہے کہ جاپان میں ایک میاں بیوی رہا کرتے تھے، جن کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ ایک دن وہ کسی مقبرے پر دُعا مانگنے کے لیے گئے اور کہا، "ہمیں ایک بچہ دو، ہم ایک بچہ چاہتے ہیں، جو بہت چلبلا اور شریر ہو۔"

دعا مانگ کر مقبرے سے واپس لوٹ رہے تھے کہ گھر کے راستے میں انھیں کسی کے رونے کی آواز سُنائی دی، جو گھاس کے جھنڈ میں سے آ رہی تھی۔ اُنھوں نے وہاں جا کر دیکھا تو ایک بہت ہی چھوٹے بچے کو سُرخ کمبل میں لپٹا ہوا پایا۔

انھوں نے کہا، "یہ وہ بچہ ہے جو ہماری دُعا کے جواب میں آیا ہے" اور اس چھوٹے بچے کو اُٹھا کر اپنے گھر لے آئے اور اپنے بچے کی طرح پالنے لگے۔

یہ بچہ بہت چھوٹا تھا، بس ایک آدمی کے انگوٹھے کے تقریباً برابر تھا، وہ بڑا ہوتا گیا، مگر اُس کا قد اتنا ہی رہا۔ چوں کہ وہ ایک انچ لمبا تھا، اس لیے اُس کا نام "انچیا" رکھا گیا۔

جب ذرا بڑا ہوا تو اُس نے اپنے والدین سے کہا، "میں آپ کا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے حفاظت سے پالا، لیکن اب میں اپنی

قسمت بنانے کے لیے باہر کی دُنیا میں ضرور جاؤں گا۔"

ماں باپ نے اس کو جانے سے روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ باہر کی دنیا میں جانے کے لیے ابھی چھوٹا ہے، لیکن اس کے اصرار کرنے پر اُس کے والدین نے بڑی محبت کے ساتھ اُس سے کہا، " اچھی بات ہے، ہم تمھیں سفر کے لیے تیار کر دیں گے۔"

انھوں نے اس کو تلوار کے طور پر استعمال کرنے کے لیے ایک سوئی دی، کشتی کے طور پر استعمال کرنے کو ایک پیالہ دیا اور چپو کے بجائے دو پتلی پتلی تیلیاں۔

انچی اپنی کشتی میں بیٹھا اور اُس نے اپنے والدین کو خدا حافظ کہا اور وعدہ کیا کہ قسمت بنانے کے بعد وہ واپس آئے گا۔

اس کے بعد وہ اپنی چاول کے پیالے کی کشتی کو اپنی تیلیوں سے کھیتا ہوا آہستہ آہستہ روانہ ہو گیا۔

وہ اسی طرح کئی میل تک چلتا رہا۔ اچانک اُس کی کشتی اُلٹ گئی۔ دریا میں ایک مینڈک تھا، جس نے کشتی کو ٹکر ماری تھی۔

انچی بہت اچھا تیراک تھا، اس لیے ساحل تک تیرتا ہوا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک لارڈ کے مکان کے آگے کھڑا ہوا تھا۔

انچی نے گھر کو غور سے دیکھا اور کہا کہ یہ ضرور کسی بڑے دولت مند کا گھر ہے۔ وہ بے خوفی سے چلتا ہوا سامنے دروازے پر آیا اور آواز دی تو ایک نوکر باہر دروازے پر آیا، لیکن وہ نوکر کسی کو دکھائی نہیں دیا۔

"یہاں میں ہوں، یہاں نیچے"! انچی چلّایا، "یہاں نیچے دیکھو!!"

نوکر سامنے کے دروازے سے فرش پر نیچے دیکھنے لگا۔ سب سے پہلے اُس نے لکڑی کی چپلوں کا ایک جوڑا دیکھا۔ یہ جوڑا لارڈ جب ٹہلنے جاتا تھا تو پہنا کرتا تھا، پھر نوکر نے قریب ہی چھوٹے انچی کو دیکھا، جو چپلوں کے ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ اُسے بہت تعجب ہوا اور جلدی سے لارڈ کو بتانے اندر چلا گیا۔

لارڈ خود سامنے کے دروازے پر آیا اور انچی کو دیکھا، جو وہاں بڑی آن بان سے کھڑا تھا، اپنی سوئی کی تلوار کے ساتھ۔

"ہیلو، کیوں چھوٹے مصاحب" لارڈ نے کہا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

انچی نے کہا،

"میں اپنی قسمت حاصل کرنے کی کوشش کے لیے باہر کی دنیا میں آیا ہوں۔ اگر آپ

مجھے رکھ لیں، تو اُمید کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنے محافظوں میں شامل کرلیں گے۔ میں چھوٹا تو ہوں، لیکن میرے پاس جو یہ عمدہ تلوار ہے، اس سے میں بہت اچھی طرح لڑ سکتا ہوں۔"

لارڈ بہت خوش ہوا، جب اُس نے ایک چھوٹے لڑکے کو اپنی باتوں میں ایسے بے باک لفظ استعمال کرتے ہوئے دیکھا۔

"بہت اچھا، بہت اچھا، تم آ سکتے ہو اور میری لڑکی کے ساتھی بن سکتے ہو، جو شہزادی ہے۔"

اس کے بعد انچی، لڑکی کا ساتھی بن گیا۔ وہ بہت اچھے دوست ثابت ہوئے۔ وہ روز ساتھ کھیلتے اور کتابیں پڑھتے۔ شہزادی نے اپنے قیمتی بکسوں میں سے ایک کپڑا نکال کر انچی کے لیے بستر بنایا۔

ایک دن انچی اور شہزادی ایک مندر کی سیر کرنے گئے، جو لارڈ کے گھر کے قریب ہی تھا کہ اچانک ایک ہرا دیو ظاہر ہوا، جو ایک جادو کا ہتھوڑا لیے ہوئے تھا۔ دیو نے شہزادی کو دیکھا تو اُس کو پکڑنے کی کوشش کی۔ انچی نے اپنی تلوار نکال لی اور دیو کے پاؤں کی انگلی پر مارنا شروع کی، لیکن اس کی کھال بہت موٹی تھی، اس لیے چھوٹی سوئی کی تلوار اس کے پار نہ جا سکی۔ دیو شہزادی کے قریب آتا جا رہا تھا، اس لیے انچی نے بھوت کے جسم پر چھلانگ لگا دی اور اس کے بازو کے اوپر چڑھ گیا، پھر اُس نے تلوار دیو کی ناک پر ماری، جس سے دیو کو غصہ آگیا اور اُس نے زور سے چیخنے کے لیے اپنا منہ کھولا۔ اسی لمحے انچی لپک کر دیو کے منہ میں کود گیا، پھر اُس نے دیو کا حلق تلوار سے کاٹنا شروع کیا۔ چونکہ دیو کا حلق نرم تھا، اس لیے سوئی سے اسے بہت تکلیف ہوئی۔ وہ بہت پریشان ہوا اور اُس نے انچی کو باہر زمین پر اُگل دیا اور بھاگ گیا، حتیٰ کہ اس نے جادو کا ہتھوڑا بھی چھوڑ دیا۔ شہزادی دوڑی اور جادو کا ہتھوڑا اُٹھا لیا، اب ہم اپنی ہر خواہش پوری کر سکتے ہیں۔" اُس نے کہا۔ اور ہتھوڑے کو ہوا میں اُچھال کر کہا، "مہربانی کرکے انچی کو بڑا کر دو۔" اور جیسے جیسے وہ ہتھوڑے کو ہلاتی رہی، انچی ایک ایک انچ بڑا ہوتا گیا۔ وہ اس کو اس وقت تک ہلاتی رہی جب تک وہ اتنا بڑا نہ ہو گیا، جتنی وہ تھی۔ وہ دونوں اس واقعے سے بہت خوش ہوئے اور لارڈ نے بھی جب یہ واقعہ سُنا تو وہ بھی بہت خوش ہوا۔ جب وہ چند سال میں اور بڑے ہو گئے تو انچی اور شہزادی کی شادی ہو گئی اور پھر وہ ہمیشہ خوش رہے۔

اُستاد کی خدمت

امیرالمومنین خلیفہ ہارون رشید کے زمانے میں بغداد میں ایک عالم فاضل بزرگ امام اصمعیؒ تھے، جو اپنی علمی فضیلت کے ساتھ نیکی اور سچائی میں بھی اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ان کے زمانے کے بعض مخالف لوگوں نے خلیفہ کے سامنے اُن کی بُرائیاں بھی کیں، لیکن امیرالمومنین کئی بار کی آزمائش کے بعد امام صاحب پر پورا پورا اعتماد رکھتے تھے جو اِن کی مخالفت کی کوشش کرتا، خود وہی خلیفہ کی نگاہ میں گر جاتا، کیوں کہ وہ سمجھ لیتے کہ یہ شخص خود ہی بُرا ہے، جو امام صاحب جیسے نیک اور صاحبِ علم انسان کی بُرائی کرتا ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ امتحان کے طور پر جب کبھی امیرالمومنین نے امام صاحب سے کسی ایسے شخص کے بارے میں اُن کی رائے معلوم کی، جو اُنھیں بُرا کہتا رہتا تھا تو امام صاحب نے ہمیشہ اُس کے لیے بھلائی کی باتیں کیں یا یہ کہہ کر بات ٹال دیتے کہ اللہ تعالیٰ نیکی اور بدی کا جاننے والا ہے، کون جانے، کون اچھا ہے اور کون بُرا ہے۔ اللہ پاک بُروں کو نیکی کی توفیق دے۔

جب امیرالمومنین کے صاحبزادے مامون رشید کی بسم اللہ خوانی کی رسم ہو چکی تو ان کی تعلیم شروع ہونے کا وقت آیا۔ پہلے محل میں شاہی اتالیق ان کو ابتدائی تعلیم و تربیت دیتے رہے۔ کچھ بڑے ہوئے تو امیرالمومنین نے ان کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام کرنا چاہا۔ وزیروں کی رائے ہوئی کہ امام اصمعیؒ کو ان کا استاد مقرر کیا جائے۔ اس سے مراد یہ بھی تھی کہ امام صاحب کی اس معاملے میں آزمائش بھی ہو جائے گی کہ وہ شہزادے کے استاد بننے کے لالچ میں اپنا مدرسہ چھوڑ کر شاہی محل میں آنا پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر انکار کریں گے تو امیرالمومنین کی ناراضی کا سبب ہوگا اور آئیں گے تو خود اُن کی فضیلت پر حرف آئے گا۔

بات یہ تھی کہ اس زمانے میں جو بڑے

بڑے استاد اور عالم فاضل تھے، وہ امیر غریب ہر ایک کو اپنے مدرسے میں ہی تعلیم دیتے تھے۔ دولت کے لالچ میں امیروں کے گھر جاکر تعلیم دینا اور اپنا مدرسہ چھوڑنا ان کی شان اور دستور کے خلاف تھا۔

جب امام صاحب کو امیر المومنین کا پیغام پہنچا تو انھوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور مہربانی سے مجھے علم کا چشمہ عطا ہوا ہے، جہاں علم کے پیاسے خود آکر اپنی اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ کسی نے آج تک چشمے کو پیاسے کے پاس لے جانے کی ہمت نہیں کی۔ اگر میں شہزادے کی تعلیم کے لیے شاہی محل جاؤں گا تو بے شمار پیاسے انتظار میں پریشان بیٹھے رہیں گے۔ ان کی پیاس کا عذاب کس کی گردن پر ہوگا۔ وزیروں نے خلیفہ سے اس بات پر بہت کچھ لگائی بجھائی کی اور بھڑکایا، مگر خلیفہ کو امام صاحب کا یہ جواب بہت پسند آیا اور وہ پہلے سے زیادہ ان کی نیکی، سچائی اور فضیلت کا قائل ہوگیا۔

آخر خلیفہ نے فیصلہ کیا کہ شہزادہ مامون رشید امام اصمعی کے مدرسے جایا کریں اور ان کی شاگردی میں رہ کر علم حاصل کریں، چناں چہ شہزادہ ایک اتالیق کے ساتھ روزانہ صبح مدرسے جاتا اور دن بھر تعلیم حاصل کرنے میں مشغول رہتا۔

کچھ مدت بعد ایک دن اتالیق نے موقع پاکر امیر المومنین سے عرض کیا، "عالی جاہ، مناسب ہو اگر کبھی آپ بہ نفسِ نفیس مدرسہ ابامیہ کا معائنہ فرمائیں اور شہزادہ صاحب کی تعلیمی حالت ملاحظہ کریں۔ خلیفہ ہارون رشید نے اس وقت اتالیق کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چند روز بعد اچانک ایک دن امام صاحب کے مدرسے جا پہنچے۔ اس وقت امام صاحب وضو کر رہے تھے اور شہزادہ مامون لوٹا ہاتھ میں لیے پانی ڈال رہا تھا۔ خلیفہ کے تشریف لے جانے سے اتالیق بہت خوش ہوا، کیوں کہ اس کا مطلب یہی تھا کہ خلیفہ کسی روز مدرسہ جائیں تو دیکھیں کہ شہزادے کو امام صاحب کی اسی طرح خدمت کرنا پڑتی ہے، جیسے ایک عام آدمی کے لڑکے کو اور خلیفہ اس بات کو کبھی گوارا نہ کریں گے اور اس طرح امام صاحب سے ضرور ناراض ہوجائیں گے۔ خلیفہ ہارون رشید نے جب یہ دیکھا تو امام صاحب سے کہا،

"ہمیں یہ دیکھ کر رنج ہوا کہ شہزادے کو آپ کی شاگردی میں داخل کرنے سے ہمارا جو مقصد تھا، وہ حاصل نہ ہوا۔"

خلیفہ کے ہمراہ جو وزیر امیر تھے یہ سُن کر، دل میں بہت خوش ہوئے کہ خلیفہ کو شہزادہ

کی توہین ناگوار گزری ہے اور اب امام صاحب پر عتاب نازل ہوگا۔ امام صاحب نے خلیفہ کی بات سُن کر اطمینان سے پوچھا، "یا امیرالمومنین، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" اس پر امیرالمومنین نے فرمایا، "یا حضرت، آپ کے فیض صحبت اور تربیت سے شہزادے کو عقل و تمیز آنی چاہیے۔ یہ تو ابھی پوری طرح اُستاد شاگرد کے آداب سے بھی واقف نہیں ہوا۔" اس پر سارے وزیر اور اتالیق حیران ہو کر دل میں سوچنے لگے کہ خلیفہ کیا کہنا چاہتے ہیں، اور اس کے بعد خلیفہ کا ارشاد سُن کر دنگ رہ گئے۔ اُنھوں نے کہا، اُستاد کی شان میں شہزادے کی یہ گستاخی ہم ہرگز برداشت نہیں کرسکتے کہ وہ صرف پانی بہا رہا ہے اور آپ کو خود اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں دھونا پڑ رہے ہیں۔ اس کو لازم تھا کہ یہ ایک ہاتھ سے پانی ڈالتا اور دوسرے ہاتھ سے آپ کے پاؤں خود دھوتا۔"

امام اصمعیؒ امیرالمومنین کی یہ گفتگو سُن کر مسکرانے لگے اور شہزادے کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیر کر فرمایا، "اللہ تعالےٰ شہزادے کو سعادت مند کرے گا۔"

اب سب وزیر امیر اور اتالیق شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے۔ اس کے بعد کسی کو امام صاحب کے خلاف کوئی بات کہنے کی جراٴت نہیں ہوئی، بلکہ ان کی علمیت، فضیلت اور نیکی کے قائل ہو کر ان کی بڑی عزت اور ادب کرنے لگے، کیوں کہ خلیفہ کی باتیں ان کی سمجھ میں آ گئیں اور اچھی طرح سمجھ گئے کہ اُستاد کا مرتبہ شاگرد کے لیے بہت بڑا ہے اور استاد کی خدمت سب سے بڑی عظمت ہے۔

ایک لڑکے نے اپنی کہانی جو کسی رسالے سے نقل کی تھی، اپنے دوست ریاض کو پڑھنے کو دی ــــ پڑھنے کے بعد ریاض نے کہا، "لیکن اسلم، یہ کہانی تو میں نے کسی رسالے میں پڑھی ہے۔"

اسلم: مگر میں نے تو اسے ابھی تک کسی رسالے میں چھپنے کو نہیں بھیجی۔

رضی الدین، کراچی

بیٹا: (والد سے) ابا جان، یہ آدمی بکری کو کہاں لے جا رہا ہے، جو بے چاری اتنی چیخ رہی ہے؟

باپ: بیٹا اس کو ذبح کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔

بیٹا: اوہ! میں سمجھا شاید اسکول میں لے جایا جا رہا ہے۔

ایم۔ جمیل تبسم۔ منٹگمری



بٹوہ کالا خوب نکالا

فہمیدہ اختر

بغداد کے شہر میں سوداگروں کا ایک بھرا بازار تھا۔ اس بازار میں پھلوں کی دُو دکانیں تھیں۔ یہ دکانیں دُو بھائیوں کی تھیں۔ یہ خربوزے اور تربوز بیچتے تھے۔ ان میں سے بڑے کا نام قاسم تھا اور چھوٹے کا ہاشم۔

قاسم کو صبح سے شام تک یہی فکر رہتی تھی کہ کسی طرح دولت مند بنے اور کوشش کرتا کہ اپنے پھل عام قیمت سے دوگنی قیمت پر بیچے۔ اس کے لالچ کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس سے پھل خریدتے گھبراتے تھے اور جس کو تربوز خریدنا ہوتا تو پہلے ہاشم کے پاس جاتے اور مناسب قیمت پر خرید لیتے، کیوں کہ خواہ مخواہ مہنگی چیز کیوں خریدی جائے۔

آخر قاسم دولت مند ہونے کے بدلے روز بروز غریب ہونے لگا۔ کیوں کہ اس کی بکری کم ہو گئی اور اس کے بجائے ہاشم امیر ہونے لگا۔ کیوں کہ وہ بہت ایمان دار اور نیک تھا۔ جب کبھی کوئی غریب آدمی اس کی دکان پر آجاتا اور اس کے پاس پوری قیمت دینے کو پیسے نہ ہوتے تو وہ اُسے خربوزے، تربوز عام قیمت سے بھی کم داموں میں دے دیتا یا مفت۔

قاسم یہ دیکھ کر سخت حیران پریشان تھا کہ اس کا بھائی جتنا مالدار ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی میں غریب ہو رہا ہوں۔

ایک دن اُس نے اپنی بیوی سے اس پریشانی کا ذکر کیا اور کہنے لگا، "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہاشم مجھ سے چھوٹا ہے۔ اتنے کم داموں پھل بیچتا ہے اور مفت بھی بانٹتا ہے، مگر اس کے گھر پر

دولت برستی ہے۔ اس کے مقابلے میں مَیں دن رات کوشش کرتا ہوں، لیکن اصل میں بھی گھاٹا ہے۔"

اس کی بیوی نے بھی اس بات پر تعجب کیا اور کہا، "تم ہاشم کے پاس جاؤ اور اس سے مالدار ہونے کی ترکیب معلوم کرو۔" قاسم نے جلدی سے کہا، "میں صرف یہی نہیں کروں گا، بلکہ اس سے کہوں گا کہ وہ مجھے اپنی دولت میں شریک کرلے۔" اور وہ فوراً اپنے بھائی ہاشم کے گھر روانہ ہوگیا۔ ہاشم نے بڑے بھائی کو آتے دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ دَوڑ کر اس سے لپٹ گیا اور بڑی خاطر مدارات کر کے اس کی بیوی بچّوں کی خیریت دریافت کی اور کہنے لگا، "بھائی جان آپ نے بڑی تکلیف کی کہ غریب خانے پر تشریف لائے۔ میری بڑی عزّت افزائی ہوئی۔"

اس پر قاسم بولا کہ مجھے تمھارے گھر آنے میں نہ تو تکلیف ہوئی اور نہ میں تمھاری عزّت بڑھانے آیا ہوں۔ میں تو تم سے صرف ایک بات معلوم کرنے آیا ہوں۔ ہاشم نے جلدی سے کہا، "فرمائیے، میں حاضر ہوں۔" قاسم نے کہا، میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں "میں اپنے تربوز مہنگے بیچتا ہوں اور تم بہت سستے، بلکہ بلا قیمت بھی بانٹتے ہو، لیکن میں مفلس ہوتا جاتا ہوں اور تم اتنے مالدار ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟" ہاشم نے ہنس کر کہا، "بھائی جان! اس کی وجہ تو صرف یہ ہے کہ میرے پاس ایک جادو کا بٹوہ ہے۔" قاسم نے جلدی سے کہا، "کیا بکواس کرتے ہو، جادو کا بٹوہ کیسا؟" اِس پر ہاشم نے اپنی جیب سے ایک کالا بٹوہ نکالا اور قاسم کو دکھاتے ہوئے کہنے لگا، "یہ دیکھیے، یہ مجھے ایک بوڑھے جادوگر نے دیا تھا۔" قاسم نے بگڑ کر کہا، "میں تمھارے سب ہتھکنڈے جانتا ہوں۔ تمھاری ان باتوں میں نہیں آؤں گا۔ مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ سچ سچ بتاؤ تمھارے پاس اتنی دولت کیسے آتی ہے؟" ہاشم نے بڑے ادب سے سر جھکا کر کہا، "بھائی جان، میں بالکل سچ کہتا ہوں، آپ خود دیکھ لیجیے" اور اس نے کالے بٹوے کو ہتھیلی پر رکھ کر کہنا شروع کیا،

کالے بٹوے، کالے بٹوے، سُن لے میری بات
سونے کے سکّوں سے بھر دے میرے بھائی کے ہاتھ

یہ دیکھ کر قاسم خوشی سے پھُولا نہ سمایا اور کہنے لگا، "یہ تو عجیب بات ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اس بٹوے سے سونے کے تربوز بھی منگا سکتے ہیں۔"

ہاشم نے کہا، "بے شک۔" اور قاسم نے جلدی سے کہا، "تو پھر یہ سارے تم لے لو اور یہ بٹوہ مجھے دے دو۔ تھوڑے دن مَیں اپنے پاس رکھوں گا۔ تمھاری طرح دولت جمع کر کے تمھارا

بٹوہ پھر تمھیں لوٹا دوں گا۔" ہاشم نے بڑی خوشی سے وہ بٹوہ بھائی کو دے دیا اور کہا، "آپ اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھیں، جو کچھ میری قسمت کا ہے، خدا مجھے ہر حال میں دے گا۔ آپ کی دولت اور خوشی سے مجھے اور زیادہ خوشی ہوگی۔"

آخر قاسم وہ بٹوہ لے کر اپنے گھر آیا اور بیوی کو دکھا کر سارا حال کہہ سنایا۔ وہ بھی حیران ہوئی، پھر سوچ کر بولی، "تم بھی بیوقوف ہو، بھلا اس بٹوے کا ہم کیا کریں گے۔ تم سونا لے آئے ہوتے۔"

قاسم نے کہا، "بیوقوف تو ہے، اس بٹوے سے تو ہم جو چاہیں گے منگائیں گے۔ سونا کیا چیز ہے۔" یہ سن کر بیوی خوب ہنسی اور قاسم کا مذاق اُڑانے لگی کہ میں ایسی اَن ہونی باتوں پر یقین نہیں کرتی، یہ سب فضول باتیں ہیں۔

قاسم نے جلدی سے بٹوہ تپائی پر رکھا اور زور زور سے کہنا شروع کیا،

کالے بٹوے، کالے بٹوے بات میری مان
سونے کے تربوزوں سے تو بھر جائے اس آن

اور دونوں غور سے بٹوے کو تکتے رہے، مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ قاسم کی بیوی بولی، "دیکھا میں جو کہتی تھی ہاشم نے تمھیں دھوکہ دیا ہے۔ یہ بٹوہ کسی کام کا نہیں۔" اتنے میں ایک تربوز نکلا، پھر دوسرا، تیسرا، چوتھا اور اس طرح ڈھیر لگ گیا۔ قاسم یہ دیکھ کر گھبرانے اور چلّانے لگا،

بس کر بٹوے بس کر یار
تجھ پر ہو اللہ کی سنوار

مگر تربوزوں کے ڈھیر سے اُن کا گھر بھر گیا، اور ایک ایک کر کے نکلتے ہی رہے۔ قاسم کی بیوی چیخنے لگی، خدا کے لیے اسے بند کرو اور قاسم گھبرا کر چلّانے لگا،

بٹوے مت پھیلا یہ گند
جلدی سے اب ہو جا بند

اور بٹوے سے تربوز باہر نکلنا بند ہو گئے۔ یہ دیکھ کر قاسم اور اُس کی بیوی بہت خوش ہوئے اور زمین پر پڑے ہوئے تربوزوں کو اُٹھانے لگے، لیکن بٹوہ اندر ہی اندر پھولتا رہا اور تھوڑی دیر میں ایک زوردار دھماکے سے پھٹ گیا۔ بٹوے کے پھٹتے ہی سارے تربوز اندر سے باہر نکل پڑے اور چھت تک جا پہنچے، پھر شاخوں میں سے ٹوٹ کر ادھر اُدھر بکھرنے لگے۔ کوئی دیوار سے جا ٹکرایا، کوئی دروازے پر جا لگا ایک طوفان مچ گیا۔ قاسم اور اُس کی بیوی خوف اور گھبراہٹ سے کانپنے اور ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ ادھر تربوز تھے کہ چاروں طرف

دوڑتے پھر رہے تھے، گھر سے نکل کر گلی میں جا پہنچے اور سڑکوں پر لڑھکتے ہوئے کودتے پھاندتے شہر کی ساری سڑکوں اور بازاروں میں پھیل گئے۔ لوگ حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ سارا شہر جمع ہوگیا۔ رفتہ رفتہ یہ خبر بادشاہ کو بھی ہوئی۔

بادشاہ نے اعلان کر دیا کہ آج سارے دفتر اور بازار بند ہیں اور تمام شہر کے لوگ تربوزوں کی دعوت کے لیے باغوں میں جمع ہوں۔

سب لوگ خوشی خوشی دعوت پر جانے لگے، لیکن قاسم اور اُس کی بیوی ایک طرف چپ چاپ غمگین بیٹھے رہے، کیوں کہ وہ پہلے کی طرح مفلس ہی رہے۔ شہر بھر میں تربوزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان سے کوئی تربوز خریدنے کو نہ آتا تھا۔

آخر اُنھوں نے ہاشم سے مدد مانگی۔ وہ بہت عقل مند تھا۔ اس نے سوچ کر ایک ترکیب نکالی۔ اُنھوں نے دو تربوز الگ رکھ لیے۔ باقی سارے اکٹھے کر کے اُنھیں تراش کر قاشیں کر لیں، پھر ان قاشوں میں سے کچھ پر نمک اور کچھ پر شکر چھڑک کر عمدہ قسم کی قاشیں سجا کر باغوں میں لے گئے۔ سب لوگ وہاں صرف تربوز لے کر گئے تھے۔ نمکین اور میٹھے تربوز دیکھ کر سارے ان کی طرف دوڑے آگئے۔ ذرا دیر میں تربوزوں کے ڈھیر بک گئے اور روپے پیسے کے انبار لگ گئے۔ ہاشم کی عقل مندی سے وہ دیکھتے ہی دیکھتے دولت مند بن گئے۔ یہ ساری دولت ہاشم نے اپنے بھائی قاسم کو دے دی۔ یہ دیکھ کر قاسم شرمندہ ہوگیا۔ اس نے ہاشم کی نیکی اور صبر سے سبق سیکھ لیا تھا۔ دو تربوز جو اُنھوں نے بچا کر رکھے تھے، خود مل کر کھانے بیٹھ گئے۔

اس کے بعد دونوں ساتھ مِل جُل کر ایک دکان سجا کر ایمان داری سے خوشی خوشی رہنے لگے۔

قاسم کی بیوی کبھی کبھی ہاشم کی سچائی اور نیکی سے خوش ہو کر کہا کرتی،

واہ میرے بھیّا!

بٹوہ کالا خوب نکالا





ہتھیلی پر آگ

پروین ایوب

کسی شہر میں ایک حکیم صاحب رہتے تھے۔

اُنھوں نے اپنے گھر میں ہی اپنا دواخانہ کھول رکھا تھا۔ حکیم صاحب کھاتے پیتے آدمی تھے۔ وہ امیروں سے تو دواؤں کی پوری قیمت لیتے تھے، لیکن غریبوں کے ساتھ بڑی رعایت کرتے تھے، اسی لیے لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان کے پاس بہت سی اچھی اچھی کتابیں تھیں۔ لوگ آتے تھے اور یہ کتابیں پڑھ کر علم حاصل کرتے تھے۔

حکیم صاحب کی ایک بیوی تھیں اور وہ بھی بہت نیک اور ہمدرد تھیں۔ محلے کی بہت سی بچیاں اُن کے پاس آکر تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

حکیم صاحب کے پڑوس میں ایک غریب عورت رہتی تھی اور اس کے صرف ایک لڑکی تھی۔ وہ لڑکی نہایت عقل مند اور ذہین تھی۔ اُس کی عمر تقریباً سات سال تھی۔ اس لڑکی کا نام روبی تھا، جو بہت خوب صورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت اور ذہانت جھلکتی تھی۔

جب وہ نہا دھوکر کپڑے پہنتی اور بالوں میں کنگھی کر کے کھیلنے کے لیے نکلتی تو بہت اچھی معلوم ہوتی۔ روبی کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، اسی لیے اس کی ماں غریب ہو گئی تھی۔ روبی کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ روزانہ حکیم صاحب کی بیوی سے پڑھنے جاتی۔

روبی ہمیشہ صاف ستھری رہتی تھی اور گندے

بچّوں کے ساتھ کبھی نہ کھیلتی۔ محلے کے سب بچّے بھی اُسے پسند کرتے تھے۔ ایک دن روبی کی ماں نے کہا، "روبی! حکیم صاحب کے گھر جا کر تھوڑی سی آگ لے آؤ۔"

روبی فوراً حکیم صاحب کے گھر گئی۔ جب وہ دروازے پر پہنچی تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دستک دی۔ حکیم صاحب نے پوچھا، "کون ہے؟" روبی نے جواب دیا، "میں ہوں آپ کی پڑوسن کی لڑکی روبی۔" حکیم صاحب نے فوراً دروازہ کھول دیا اور روبی کو اندر بُلایا۔

حکیم صاحب نے پوچھا، "کہو بیٹی! کیا بات ہے؟" روبی نے کہا، "میری امّی نے تھوڑی سی آگ منگائی ہے۔" حکیم صاحب نے کہا، "تم کوئی برتن آگ لے جانے کے لیے لے آؤ۔" لڑکی نے جواب دیا، "آپ اس کی فکر نہ کریں۔ صرف مجھے آگ لے جانے کی اجازت دے دیں، پھر دیکھیے میں کیسے لے جاتی ہوں؟" لڑکی اور حکیم صاحب کی باتیں اُن کی بیگم کمرے میں بیٹھی سُن رہی تھیں۔ چھالیہ کاٹتے کاٹتے اُٹھیں، پھر تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی روبی کے پاس پہنچ کر کہنے لگیں، "بیٹی لے جاؤ، بھلا آگ کے لیے بھی کوئی انکار کر سکتا ہے۔" یہ سُن کر لڑکی چولھے کے پاس گئی۔ پہلے اس نے بہت سی راکھ اپنی ہتھیلی پر جمائی، پھر دو تین انگارے اس پر رکھ لیے۔

حکیم صاحب اور اُن کی بیگم اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے، انھوں نے اس کی عقل مندی کو دیکھ کر بہت تعجب کیا۔ جب لڑکی آگ لے کر جانے لگی تو حکیم صاحب نے کہا، "شاباش بیٹی، تم بہت عقل مند اور ذہین ہو، خدا تمھیں علم کی دولت سے مالا مال کرے۔" لڑکی اُن کا شکریہ ادا کرتی ہوئی آگ لے کر اپنے گھر کو چلی گئی اور ماں سے جا کر سارا واقعہ سُنایا۔ ماں نے اپنی بیٹی کی عقل مندی کا حال سُنا تو بہت خوش ہوئی اور مسکرانے لگی۔

روبی کی ماں روبی کی باتیں سُن کر بہت خوش ہوتی تھی اور خوب پیار کرتی تھی۔ محلے کے لوگ بھی روبی کو بہت پیار کرتے تھے اور بچّوں کو روبی کی طرح اچھی بچی ہونے کی تاکید کرتے۔

وہ روبی کے ساتھ ہمدردی کرنے کی کوشش کرتے۔ روبی ہر شخص کی نظر میں ایک کھلونا بنی ہوئی تھی۔ سب لوگ روبی کی ذہانت اور عقل مندی کی تعریف کرتے تھے۔

جب روبی آٹھ سال کی ہوئی تو اُس کی ماں نے روبی کو قریب کے اسکول میں داخل کر دیا۔ روبی نے محنت سے پڑھنا شروع کیا اور بہت جلد ہر اُستاد کی نظر میں چڑھ گئی۔ وہ اسکول کا پورا کام کرتی اور وقت پر کھیلتی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ اپنی کتابیں پڑھتی رہتی۔

روبی نے خوب محنت سے اسکول میں کام کیا اور اپنا سارا کورس یاد کر لیا۔ امتحان میں اُس نے بہت اچھا کام کیا اور اوّل نمبر پاس ہوئی۔

بچّوں کے رومی

عشرت رحمانی

حضرت مولانا روم رح کی مثنوی میں جو منظوم کہانیاں ہیں ان میں ہر عمر کے لوگوں کے اخلاقی سبق اور نتیجہ خیز دلچسپ نکتے پوشیدہ ہیں۔ یہ مثنوی فارسی زبان میں ہے۔ ننھے منّے پڑھنے والوں کے لیے ان کہانیوں کو اُردو میں منتقل کرکے پیش کیا جارہا ہے۔

بادشاہ اور غلام

ایک تھا بادشاہ۔ اس کا تھا ایک غلام، جو بہت بے وقوف اور لالچی تھا۔ وہ رات دن بادشاہ کی خوشامد کرتا، مگر اپنے فرض انجام دینے کی طرف کبھی توجہ نہ کرتا۔ بادشاہ نیک، منصف اور عاقل تھا۔ جب اس نے اس غلام کو اپنے کاموں سے غفلت کرتے دیکھا تو حکم دیا کہ اس کی تنخواہ کم کردی جائے۔

غلام اپنی تنخواہ کم ہوجانے سے بہت ناراض ہوا، لیکن بے وقوف تھا، اس لیے اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ جس وجہ سے اس کی تنخواہ کم ہوئی ہے، اسے درست کرے اور غفلت چھوڑ کر اپنے کام ٹھیک کرے۔ اُس نے بادشاہ سے معافی مانگنے اور اپنی حالت سدھارنے کے بجائے بادشاہ کی خدمت میں ایک درخواست دی۔ جس میں الٹی اس کی شکایت کی اور لکھا کہ میں اس قدر وفادار اور لائق ہوں اور اپنے کام عمدگی اور خوبی سے انجام دیتا ہوں، مگر حضور نے میرے ساتھ ناانصافی کی ہے اور میری تنخواہ کم کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ عقل سے کام نہیں لیتے اور اچھے بُرے میں کوئی

تمیز نہیں رکھتے۔

غلام کو تنخواہ کے ساتھ شاہی باورچی خانے سے روزانہ کھانا بھی ملتا تھا۔ اس کی تنخواہ کم ہونے کے ساتھ اس کا کھانا بھی بند کر دیا گیا تھا۔

دربار کے ایک عقل مند امیر نے اس کی درخواست دیکھی تو کہا کہ "اے نادان تیرا جسم وہ عرضی ہے، جسے غور سے دیکھنا تیرا فرض ہے۔ اس کا جائزہ لے اور دیکھ کہ آیا وہ بادشاہ کے حضور پیش کرنے کے لائق ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو پہلے اس کی اصلاح کر، اسے درست کر اور اسی طرح اپنی عرضی کے ایک ایک حرف پر غور کر اور اس کی درستی پر نظر کر کہ وہ بادشاہ کے حضور میں پیش کرنے کے لائق نہیں۔ اس سے تیرا مطلب پورا نہ ہوگا، لہٰذا تجھے چاہیے کہ تو اس عرضی کو چاک کر اور اپنے جسم اور عادت کی اصلاح کی عرضی پیش کر کے اپنا مدعا حاصل کرنے کی امید کر!"

غلام نے یہ بات سنی اور عرضی اپنے پاس رکھ کر پہلے شاہی باورچی خانہ کے داروغہ کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ "اے کنجوس تیرے سخی اور فیاض بادشاہ کا باورچی خانہ تو دریا دلی کا خزانہ ہے، پھر اس سے میرا روزینہ بند ہونے کا کیا سبب ہے؟" داروغہ نے جواب دیا کہ "میں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا ہے، بلکہ شاہی حکم سے مجبور ہوں۔ یہ کنجوسی نہیں ہے، بلکہ شاہی مصلحت ہے اور اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

غلام نے کہا کہ "خدا کی قسم یہ سراسر ناانصافی ہے۔ بادشاہ نے سونے کو مٹی سمجھ کر نظروں سے گرا دیا ہے۔ شاہی خزانہ میری تنخواہ سے خالی تو نہیں ہو جائے گا۔"

داروغہ نے اسے بہت سمجھایا اور معافی نامہ پیش کرنے کی ہدایت کی، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور داروغہ کو برا بھلا کہتا رہا۔

اس کے بعد اس غلام نے باورچی خانے کے ایک ایک ملازم سے باتیں کرنا شروع کیں اور ہر ایک سے کھانے کو مانگا، مگر سب نے صاف انکار کر دیا کہ ہم بادشاہ سلامت اور داروغہ کے

حکم سے مجبور ہیں۔ جب غلام نے ایک ملازم کو بہت مجبور کیا تو اُس نے کہا، "اے شخص تو اپنی ناسمجھی میں کمان کو الزام نہ دے۔ یہ تیر جو تجھے لگا ہے، وہ کمان دار کی طرف سے چلا ہے اور تیر انداز کی قوت نے تیری طرف پھینکا ہے۔" آخر غلام نے غم اور غصّے سے بگڑ کر بادشاہ کی خدمت میں اپنی درخواست پیش کردی۔ اس نے اس درخواست میں بادشاہ کی تعریف کی اور اس کی فیاضی اور سخاوت کو سراہنے کے لیے ظاہری الفاظ میں بڑی چاپلوسی سے کام لیا، لیکن اندرونی طور پر اس کے دل کا رنج اور شکایت چھپی ہوئی تھی اور غصّہ کی بو آتی تھی۔

بادشاہ نے اس کی یہ درخواست دیکھی تو اس پر کوئی توجہ کیے بغیر ایک طرف پھینک دی اور اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک وزیر کو مخاطب کرکے کہا،

"اس شخص کو صرف کھانے کی فکر ہے۔ بے وقوف آدمی نہ کام کا نہ کاج کا۔ ایسے احمق کی بات کا جواب دینے سے خاموشی بہتر ہے۔ یہ صرف دولت اور کھانا پینا چاہتا ہے، ہماری قربت کا اسے کوئی غم نہیں۔ نہ اپنے فرض کی طرف توجہ ہے اور نہ ہماری خدمت کا خیال ہے۔ اصل کو بھول کر اِدھر اُدھر کی بے ہودہ باتوں میں پھنسا ہوا ہے۔ ایسے شخص کا انجام کچھ بھی نہیں۔"

جب غلام کو عرضی کا کوئی جواب نہ ملا تو اور زیادہ غمگین ہوا اور رنج کے مارے راتوں کی نیند اڑ گئی۔ اسے دن رات اپنی عرضی کے جواب کی فکر تھی۔ کبھی اسے یہ بھی خیال آتا کہ کہیں وزیر نے میری درخواست بادشاہ کو پیش نہ کی ہو۔ یہ خیال کرکے وہ سوچنے لگا کہ ایک عرضی اور دے دوں اور اسے کسی ایمان دار اور لائق امیر کے ذریعے پیش کروں اور داروغۂ باورچی خانہ پر بھی الزام لگایا کہ اس نے بادشاہ کو میری طرف سے بہکایا اور غلایا ہے، لیکن یہ نادان غلام اپنی اصلاح کی طرف سے بالکل غافل تھا اور کوتاہی اور غلطی ماننے کو تیار نہ ہوا۔

اب اس نے ایک دوسری درخواست تیار کی اور اس میں یہ بھی لکھا کہ میں نے ایک درخواست جو پہلے پیش کی تھی، وہ کسی بے ایمان آدمی نے بادشاہ کے سامنے پیش نہیں کی۔ یہ عرضی پہلے کی طرح بادشاہ کے حضور پہنچ گئی اور بادشاہ نے اسے بھی پڑھ کر کوئی جواب دیے بغیر خاموشی اختیار کر لی۔

چناں چہ غلام ہر بار یہی سمجھتا رہا کہ میری عرضی بادشاہ کے روبرو پیش نہیں ہوتی اور برابر عرضی پر عرضی بھیجتا رہا۔

پانچویں عرضی پیش ہونے پر ایک امیر نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ آخر یہ حضور کا قدیم غلام ہے، اگر حضور اس کی عرضی پر توجہ فرما کر اس کے جواب دینے کی تکلیف فرمائیں تو حضور کی عنایت اور بخشش ہوگی۔

بادشاہ نے اسے جواب دیا، "میں کس کا جواب دوں۔ یہ شخص احمق ہے۔ احمق کی بات کا جواب دینا بھی حماقت سے کم نہیں اور یہ اپنی اصل کو بھول گیا ہے۔ بجائے اپنی غلطی ماننے کے غلط باتیں کرتا رہتا ہے اور دوسرے لوگوں پر جھوٹے الزام لگاتا ہے۔ اپنا قصور نہیں مانتا، اس لیے یہ خدا کا مردود ہے۔ اس حالت میں اگر میں اسے معاف کر دوں تو وہ اپنے قصور پر شرمندہ ہونے کے بجائے غلطیوں اور جرم پر اور زیادہ دلیر ہوگا، اس لیے ایسے نادان اور جاہل شخص کو رعایت اور اس پر مہربانی کرنا عقل مندی نہیں، جو اپنی غلطی سے انکار کرے اور سچائی سے منھ موڑ کر فضول باتوں میں پڑے۔ ایسا انسان دنیا اور دین دونوں میں کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ مخلوق کی برائی میں اپنی بھلائی سمجھتا ہے۔ اپنے عیب چھپاتا اور ان کے بدلے دوسرے کے عیب تلاش کرتا ہے۔ جو اپنی برائیوں کو بھول کر دوسروں میں بُرائی پھیلائے، وہ معافی دینے اور منھ لگانے کے قابل نہیں۔"

★ ★ ★



افریقہ کے جنگل میں چھے دن

خالد خلیل نعمانی

جوں ہی صبح کو ہمارا ہوائی جہاز نیروبی کے ہوائی اڈے پر اترا تو مَیں نے والد صاحب کے پُرانے شکاری دوست لوزاٹو کو فوراً پہچان لیا، انھیں میرے نیروبی آنے کی اِطلاع والد صاحب نے بذریعہ تار دے دی تھی، اِسی لیے وہ ہوائی اڈے پر میرے منتظر تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر انھیں سَلام کیا۔ وہ مجھے دعائیں دینے لگے اور والد صاحب کی خیریت پوچھی۔ ہوائی اڈے کی عمارت سے نکل کر ہم ایک بڑی جیپ میں بیٹھ کر چچا لوزاٹا کے گھر پہنچ گئے۔ پروگرام کے مطابق ایک دن نیروبی میں قیام کرنا تھا، مگر میں افریقہ کے گھنے جنگل میں شیر کے شکار کے لیے بے چین تھا۔ آخر تھوڑی سی بحث کے بعد چچا لوزاٹا شکار پر فوراً جانے کی تیاری میں لگ گئے اور میں ہلکا سا ناشتہ کر کے سفر کی تھکن دُور کرنے کے لیے لیٹ گیا۔

تین بجے سہ پہر چچا لوزاٹا نے جگا کر کہا، "سب اِنتظام مکمل ہے۔ تم جلدی سے کھانا کھالو، تاکہ ہم روانہ ہوں۔"

چار بجے ہمارا قافلہ، جو ایک بڑی بند جیپ کار اور چار حبشی نوکروں پر مشتمل تھا، روانہ ہوا۔ جیپ کار چچا لوزاٹا خود ہی چلا رہے تھے۔ ہمیں تانگا نیکا سے ہو کر جانا پڑا، اِس

لیے کہ یہاں کچھ ٹوٹی پھوٹی سڑکیں تو ہیں۔
دوسرے راستے پر گھنا جنگل تھا، جس میں صرف پیدل چلا جا سکتا تھا اور یہ راستہ دشوار تھا۔ دوسرے دن سہ پہر کے قریب ہم سرنگیٹی نامی میدان سے گزر رہے تھے تو وہاں ہمیں بے شمار جنگلی جانور، زیبرے، زرافے اور بارہ سنگھے نظر آئے۔ چچا لوزاٹا نے ہمیں بتایا کہ تانگانیکا کے اس علاقے میں شکار کھیلنا منع ہے، لہٰذا ہم نے کسی جانور پر بھی گولی نہیں چلائی، البتہ قریب سے گزر کر ان کی تصویریں لیتے رہے، اس لیے کہ جیپ کو دیکھ کر دوسرے جانور اسے بھی ایک نیا اور ان دیکھا جانور سمجھ کر اس کے اور قریب آ جاتے۔ جیسے ہی جانور قریب آنے لگتے، ہم جیپ کا انجن بند کر کے خوب تصویریں لیتے اور جب ہم جیپ اسٹارٹ کرتے، تب وہ ڈر کے مارے بھاگ کر جھاڑیوں میں چھپ جاتے۔

ایک گینڈے نے تو دور سے ہمیں دیکھتے ہی اپنے کھر زمین سے مارنے شروع کر دیے، جس کا مطلب ہم فوراً سمجھ گئے کہ وہ ہم پر حملہ کرنا چاہتا ہے، لہٰذا جیسے ہی وہ گینڈا دوڑتا ہوا ہمارے سامنے آیا تو چچا لوزاٹا نے فوراً جیپ کا رخ بائیں طرف موڑ لی اور گینڈے صاحب سیدھے ہی بھاگتے چلے گئے۔ گینڈے کو دو تین بار اور اسی طرح جھکائیاں دیں تو وہ تنگ آ کر درختوں میں غائب ہو گیا۔

تیسرے دن صبح ہم اس جگہ پہنچے، جہاں ہمیں اپنا مستقل کیمپ لگا کر گرد و نواح میں شکار کرنا تھا۔

ہمارا تھکن کی وجہ سے برا حال تھا۔ جیپ میں بیٹھے بیٹھے ہمارے اعضا جواب دے گئے تھے۔ نوکروں نے جلدی جلدی چائے بنائی۔ ہم سب نے چائے پی کر تھوڑا سا آرام کیا اور پھر تھوڑی سی جگہ صاف کر کے اپنے خیمے نصب کیے۔ خیمے نصب کرنے کے بعد نوکر تو سوکھی لکڑیاں جمع کرنے چلے گئے، تاکہ خیمے کے اردگرد رات کو آگ جلا کر سانپوں اور جنگلی جانوروں کو خیموں سے دور رکھ سکیں۔

چچا لوزاٹا مجھے یہاں کے جانوروں کے متعلق تفصیل سے بتانے لگے۔ چچا لوزاٹا پرانے تجربہ کار اور پیشہ ور شکاری ہیں، انھیں اس جنگل کے چپے چپے سے واقفیت تھی۔ وہ جانوروں، خصوصاً شیروں کے پیروں کے نشان دیکھ کر یہ بتا دیتے کہ شیر نر ہے یا مادہ اور یہ بھی کہ وہ کتنی عمر کا ہے۔ انھیں یہاں کے

جانوروں کی قسمیں اور ان کی عادتوں سے بھی اچھی طرح واقفیت تھی۔ پانچ سال پہلے جب والد صاحب افریقہ آئے تھے، تب سے چچا لوزاٹا والد صاحب کے دوست بن گئے تھے اور جب سے والد صاحب نے چچا لوزاٹا کو اپنے ملک بلا کر سندر بن میں شکار کرایا تھا، تب سے تو وہ بہت ہی گہرے دوست بن گئے تھے۔

جلد ہی نوکر بہت سی خشک لکڑیاں لے آئے اور خیموں کے چاروں طرف اچھی طرح اوپر تلے چُن دیں۔

ہم بہت تھکے ہوئے تھے، اِس لیے رات کا کھانا کھاتے ہی میں اور چچا لوزاٹا اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔ چاروں حبشی نوکروں نے رات بھر پہرہ دینے کے لیے تھوڑے تھوڑے وقفے سے جاگنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔

آدھی رات گزرنے کے بعد اچانک رائفل کی گولی اور اس کے ساتھ دھماکے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے فوراً رائفل اٹھائی اور انگلی لبلبی پر رکھ کر آہستہ آہستہ خیمے سے نکلا۔ باہر نکل کر دیکھا تو چچا لوزاٹا بھی رائفل ہاتھ میں لیے باہر آ چکے تھے۔ باہر چچا لوزاٹا کے خیمے کے دائیں جانب ایک چیتا مُردہ پڑا تھا اور اس کے قریب ہمارا نوکر زمبو کھڑا تھا۔ ہمارے معلوم کرنے پر اس نے بتایا کہ ایک گھنٹہ پہلے میں نے اس چیتے کو خیموں سے کچھ دُور چکر لگاتے ہوئے دیکھا تو میں نے چاروں طرف اور لکڑیاں ڈال کر آگ اور بھی تیز کر دی۔ اس کے بعد چیتا میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ میں سمجھا کہ چیتا جا چکا ہے، مگر چیتا تو تاک میں لگا ہوا تھا۔ میں آپ کے خیمے کی طرف منھ کر کے بیٹھ گیا اور یہ چیتا میرے بائیں طرف جو درخت ہے، اس پر چڑھ گیا۔ وہ اِتنی خاموشی سے درخت پر چڑھا کہ مجھے اس کا پتہ ہی نہیں چلا۔ جب وہ آہستہ آہستہ اس شاخ پر آیا، جو ہمارے خیموں کی طرف جھکی ہوئی ہے تو وہ شاخ اس کا بوجھ بَرداشت نہ کر سکی اور چرمرائی۔ میں نے فوراً بائیں طرف گھوم کر دیکھا تو چیتا مجھ پر چھلانگ لگانے ہی والا تھا، میں نے فوراً ہی اس کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ خوش قسمتی سے گولی اس کے سر میں لگی اور اس کے دماغ کے پرخچے اڑاتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی اور چیتا نیچے گرتے ہی مر گیا۔

اس کے بعد رات کو اور کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

صبح اٹھتے ہی ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے سب سے پہلے اپنے خیموں کی جگہ تبدیل کی اور ایک ہموار اور کچھ اونچی پہاڑی پر خیمے نصب کیے۔ اس کے بعد چچا لوزاٹا، میں اور ایک نوکر بند جیپ کار پر سوار ہو کر شیر کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہمیں زیبروں کا ایک غول نظر آیا، پھر کئی زرافے ملے۔ آخر دو میل اور چلنے کے بعد ہم جیپ سے اتر کر بائیں طرف واقع چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی طرف چلے۔ چچا لوزاٹا کو آخر ایک درخت کے نیچے سوتا ہوا شیر نظر آ ہی گیا۔ انھوں نے دُوربین مجھے دیتے ہوئے کہا، "دیکھو کتنا خوب صورت شیر ہے۔" میں نے دوربین سے دیکھا تو واقعی وہ بہت خوب صورت اور بڑا شیر تھا، جو اطمینان سے سویا ہوا تھا۔

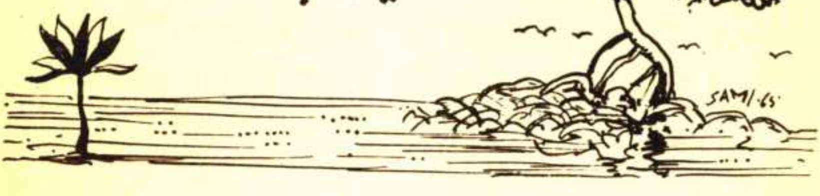
شیر ہم سے تقریباً تین سَو گز دور تھا، ہماری دائیں طرف گھنا جنگل تھا اور بائیں طرف پہاڑی۔ دائیں طرف گھنے جنگل سے جانا ناممکن تھا۔ آخر ہم نے بائیں طرف پہاڑی کے پیچھے سے جانے کا فیصلہ کیا۔ پہاڑی کا چکر کاٹ کر ہم پیٹ کے بل لیٹ کر آگے بڑھنے لگے۔ شیر سے دس گز دُور پہنچ کر چچا لوزاٹا نے اشارہ کیا کہ اب گولی چلاؤ۔ میں ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھ گیا اور شیر کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ گھبراہٹ اور جلدی میں رائفل سے دونوں گولیاں آگے پیچھے چلیں اور شیر کے سیدھے کندھے میں لگیں۔ شیر گولیاں لگتے ہی اٹھا اور ہماری طرف دیکھ کر غرانے لگا۔ وہ چھلانگ لگانے ہی والا تھا اتنے میں نوکر نے دوسری بھری ہوئی رائفل مجھے تھما دی۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تیسری گولی بھی فوراً چلائی۔ تیسری گولی شیر کے دل میں اتر گئی اور شیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ راستے میں ہم نے دو بارہ سنگھے بھی شکار کیے اور رات کو خوب مزے سے ان کا گوشت بھون کر کھایا۔ بارہ سنگھے کا گوشت زیادہ لذیذ نہیں ہوتا، اس لیے ہم زیادہ گوشت نہیں کھا سکے۔

دوسری رات کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا اور ہم رات بھر اطمینان سے سوئے۔ صبح ناشتہ کرنے کے بعد پھر شکار کے لیے چل پڑے اور شام تک ہم نے ایک شیر، دو زرافے اور ایک زیبرا شکار کیے اور چھ دن کے شکار میں ہم نے تین شیر، پانچ زرافے اور تین زیبرے مارے اور ساتویں دن واپس تانگانیکا کا رُخ کیا۔ تانگانیکا سے ہوتے ہوئے ہم نیروبی پہنچے۔ دو دن نیروبی میں ٹھیر کر تیسرے دن میں چچا لوزاٹا اور چاروں ملازموں سے رخصت ہوا اور جہاز میں سوار ہو کر اپنے وطن روانہ ہوا۔

(ختم)

مین گروو

ایک چلنے والا درخت



ممائی کی خلیج بیکنی کے درمیان جن جزیروں میں پانی کم گہرا ہے، وہاں دور تک عجیب و غریب نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔ یہاں کنارے کنارے مین گروو (MANGROVE) کے درخت ہیں، جو ہمیشہ سمندر کی طرف چلتے جاتے ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی جنگل اس دلدلی جنگل کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ہر درخت کے چاروں طرف جڑوں کا ایک جال ہوتا ہے، جو اس کے تنے سے لگا رہتا ہے اور اس میں جوار بھاٹے کے وقت اکثر آسٹر (OYSTERS) (ایک قسم کی سیپی) چمٹے رہتے ہیں اور انگریزی کی یہ کہاوت یہاں صحیح ثابت ہوتی ہے کہ درختوں پر آسٹر پکڑے جاتے ہیں۔ مین گروو کی لمبی لمبی جڑیں نیچے کیچڑ و مٹی میں دھنسی رہتی ہیں۔ یہی جڑیں درخت کے پیر کا کام دیتی ہیں اور درخت سمندر کی طرف آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ مین گروو جھاڑی کی شکل میں اگنا شروع ہوتا ہے اور جب اس کو پھلنے پھولنے کے لیے موقع ملتا ہے تو یہ درخت ایک لمبے کھمبے کی طرح ہو جاتا ہے اور اس کی اونچائی ۱۰۰ فیٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ تنے کا قطر دو سے تین فیٹ تک ہوتا ہے۔ ان درختوں کو عمارتی کاموں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مین گروو کی سرخ اور

سخت لکڑی بہت دیرپا ہوتی ہے۔ اور اس میں کیڑا بھی نہیں لگتا اور یہ خود بھی جلد نہیں گلتی۔ اسی درخت سے ایک چیز (TANNIN) نکلتی ہے جو چمڑا کمانے کے کام آتی ہے۔ سب سے پہلے اس کا استعمال ۱۲۳۰ء میں ہوا ہے۔ عرب کے ساحل پر آباد مُوروں نے اس کی چھال کو اس قابل پایا کہ اس سے چمڑا کمایا جا سکتا ہے۔ آج کل تمام جگہ جہاں جہاں یہ درخت ہوتے ہیں، اس کی چھال سے ایک قسم کا جوہر نکالا جاتا ہے۔ مڈغاسکر، موزمبک، ٹانگا نیکا، بورنیو، انڈونیشیا اور ہندستان میں چوں کہ یہ درخت ہوتے ہیں، اس لیے وہاں اِن کا جوہر تیار کیا جاتا ہے۔

بنت البحر

دنیا میں ایک عجیب مخلوق کے متعلق دل چسپ کہانیاں مشہور ہیں۔ اُسے "مرمیڈ" یا "بنت البحر" کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کا سر اور دھڑ عورت کا ہوتا ہے اور دُم مچھلی کی۔ یہ کہانیاں شاید ایک بحری جانور "مناٹی" کو دیکھ کر مشہور کی گئیں، جسے سمندری گائے کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کیوں کہ وہ نباتات کھا کر زندہ رہتی ہے۔ دودھ پلانے والا یہ عظیم جانور منطقۂ حارّہ کے دریاؤں اور سمندروں میں پایا جاتا ہے۔

اس جانور کی شکل سیل جیسی ہوتی ہے، لیکن وہ کچھ زیادہ موٹا اور سست رفتار ہوتا ہے۔ مادہ مناٹی صرف ایک تیرنے والے عضو کے سہارے اکثر پانی پر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنے بچّے کو بھی اپنی چھاتی سے چپٹائے رکھتی ہے۔ دُور سے وہ غالباً عورت معلوم ہوتی ہوگی، لیکن چوں کہ اُس کا نچلا حصّہ بالکل مچھلی جیسا ہوتا ہے، اس لیے اس کے متعلق عجیب و غریب روایات مشہور ہو گئیں۔ لوگ اُسے مرمیڈ یا بنت البحر کہنے لگے۔



سّو بیٹوں کا باپ

خواجہ عبدالمجید

ایک آدمی کے پورے ایک سو لڑکے تھے۔ ان کے کھانے پینے، کپڑوں، کھلونوں۔ مٹھائیوں اور دوسری ضرورتوں پر بہت زیادہ خرچ اٹھتا تھا، پھر بھی وہ کبھی اس بات کا دل میں ملال نہ لایا اور کسی نہ کسی طرح وہ ان کے اخراجات برداشت کرتا رہا۔ اسی امید پر وہ اس دن کا انتظار کرتا جب یہ سب بچے جوان ہوں گے۔ میری ذمے داریوں اور اخراجات میں کمی آجائے گی، لیکن آہ جب یہ بچے جوان ہوئے تو سب بچوں نے اپنے باپ کے آگے یہ مطالبہ کر دیا کہ "ابا جان، اب ہماری شادی کرنے کی عمر ہوگئی ہے۔ ہمیں اچھی سی خوب صورت بیویاں لا دیجیے"۔

یہ سن کر باپ کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ ہوگیا، مگر کیا کرتا۔ بیٹوں کے مطالبوں کے آگے وہ مجبور ہوگیا تھا۔

چناں چہ غریب بوڑھا روزانہ اپنے ٹٹو پر بیٹھتا اور رشتوں کی تلاش میں نکل جاتا اور شام کو ناکام گھر واپس لوٹتا۔ آخر ایک دن وہ حسبِ سابق رشتوں کی تلاش میں جا رہا تھا کہ اس نے کسی دوسرے بوڑھے کسان کو زمین پر ہل چلاتے دیکھا۔ اس کسان کے زار و قطار آنسو آنکھوں سے بہہ رہے تھے اور زمین میں جذب ہوتے جاتے

تھے۔ بوڑھے آدمی نے جو دیکھا تو اس نے کسان سے اس کے رونے کا سبب پوچھا، "آپ مینھہ کی طرح آنسو کیوں بہا رہے ہیں؟"

"آپ کو کیا خبر؟" کسان نے کہا، "اگر آپ کے پاس میری طرح پوری ایک سو لڑکیاں ہوتیں تو آپ کو پتہ چلتا کہ انھیں کس طرح پالا جاتا ہے؟"

"بھئی ہم خوب ملے!" بوڑھے آدمی نے ٹٹّو سے کودتے ہوئے کہا۔

جلد ہی دونوں بہت گہرے دوست بن گئے۔ ان کے لڑکے اور لڑکیاں بھی ایک دوسرے سے ملے اور آنا جانا بھی شروع ہوگیا۔ چناں چہ دونوں باپوں نے اپنی اپنی اولاد کی ایک دوسرے سے شادیاں کرنے پر اتفاق بھی کرلیا اور طے کیا کہ ایک ہی دن ان سب کی شادیاں کردی جائیں۔

اب لڑکوں کے باپ کی مصروفیت بہت بڑھ گئی۔ بہت سی ذمّے داریاں اس کے سر پر آن پڑی تھیں، جو اس کو پوری کرنی تھیں۔ ان کے قبیلے میں رسم تھی کہ شادی بڑی شان اور سج دھج سے کی جائے۔ جب دولھا برات کے ساتھ آکر اپنی دلہن کو لے جاتا ہے تو اس کی دلہن کے ساتھ اس کی دو سہیلیاں، گواہ، پیادہ آدمی اور جھنڈے اٹھانے والے اور دیگر مہمان ساتھ جاتے تھے۔ بوڑھے آدمی کو ہر لڑکے کے لیے ان آدمیوں کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ وہ تھک گیا تھا اور شادی کے روز گھبرا بھی گیا تھا۔ بوڑھے آدمی کو اس بات کی بھی خبر نہیں تھی کہ وہ اپنے کسی بیٹے کو گھر بھول آیا تھا۔

برات دلہن کے گھر بہ خیریت پہنچ چکی تھی، تحفے تحائف کے تبادلوں اور دعوت سے فراغت کے بعد دلہنیں ساتھ لے کر وہ واپس سفر کو لوٹنے لگے۔ شام کا دُھندلکا چھا رہا تھا۔ راستے میں کوئی ناخوش گوار واقعہ نہیں ہوا، یہاں تک کہ وہ چوڑے سے دریا پر پہنچ گئے، جس کا نام بدنصیب دریا تھا۔ اس دریا کے اوپر ایک بہت بڑا پُل تھا۔ جب برات پُل پر سے گزرتے ہوئے پُل کے عین بیچ میں پہنچی تو پُل سُکڑنے لگا۔ گھوڑے ہنہنانے لگے اور عورتیں اور دُلہنیں چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ سب مَرد پیچ و تاب کھا کر چلّانے لگے، جیسے کوئی انھیں اسفنج یا نیبو کی طرح نچوڑ رہا ہے۔

اچانک دریا کے دوسرے کنارے

سے ایک آواز آئی "اس برات کا سربراہ کون ہے؟" ساری برات نے ایک کالا سا جن دیکھا، جو دھندلکے میں بہت بلند و بالا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"میں اس بارات کا سربراہ ہوں"۔ بوڑھا آدمی اونچی آواز میں بولا" اگر یہ پل آپ کا ہے تو برائے مہربانی میرے سارے مہمانوں کو اس پر سے گزر جانے دیں"۔

جن نے کہا" میں ایک شرط پر گزرنے دُوں گا۔ اگر تم مجھ سے وعدہ کرو کہ جو آدمی تم گھر میں بھول آئے ہو، وہ میرے حوالے کردو۔ اگر تم اس شرط کو تین ۳ سال کے لیے تسلیم کرتے ہو تو وہ تمھیں واپس مِل جائے گا۔ کیا یہ سودا تمھیں منظور ہے؟"

"ہاں ہاں منظور ہے"۔ بوڑھے نے جواب دیا۔ چناں چہ پل جلد ہی کھل گیا۔ برات آرام سے گزر گئی اور جن غائب ہوگیا۔

جب برات گھر کے قریب پہنچی تو انھوں نے ایک اکیلے آدمی کو اپنی طرف دُور سے آتے دیکھا۔ یہ لڑکا اس بوڑھے کے سَو بچوں میں سے ایک تھا، جو گھر رہ گیا تھا۔

"آہ! میرے بچے!"۔ بوڑھے نے بھیانک سی چیخ ماری" میں تو تمھیں کبھی بھی نہیں بھُولا تھا۔ تمھیں کیوں بھُول گیا ہوں۔ میرے بچے، تم کہاں تھے؟"

"ابا جان! مَیں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرے لیے بھی بیوی لائے ہیں؟ مَیں کام سے بہت تھک گیا تھا۔ رات گئے تک میں شادی کی تیاریاں کرتا رہا، اس کے بعد مجھے نیند آگئی اور میں دوپہر تک سوتا رہا"۔ لڑکے نے جواب دیا۔

تمام چُپ تھے۔ موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ خاموشی سسکیوں سے ٹوٹی، پھر بوڑھے نے کہا کہ وہ ایک کالے جن کے قبضے میں آگیا ہے اور سارا واقعہ اُسے سُنا دیا۔ تیسرے دن وہ جن اس لڑکے کو لینے کے لیے آگیا۔ جب وہ جُدا ہونے لگے تو لڑکے کی دُلہن اور باپ نے لڑکے سے کہا، "اپنے دل کو مضبُوط رکھنا۔ ہم تمھیں لینے کے لیے پورے تین ۳ سال کے بعد آئیں گے"۔ یہ عرصہ کس طرح گزرا، ناقابلِ بیان ہے۔ بوڑھا باپ ان تین ۳ سالوں میں ایک دفعہ بھی نہ مُسکرایا۔ آخر خدا خدا کر کے تین سال کا طویل عرصہ گزرا۔ بوڑھا باپ اپنے بچے کو لینے کے لیے دریائے بدنصیب پر گیا۔ اُدھر وہ کالا جن بھی بوڑھے سے ملنے کے لیے نکلا۔

جن کے ہاتھ میں ایک لٹھ تھا، جس کی چھتری پر ایک چڑیا، ایک فاختہ اور ایک کوئل بیٹھی تھی۔

"اگر تم بتا سکتے ہو کہ ان میں تمھارا کون سا بیٹا ہے تو تم اسے لے جا سکتے ہو؟" جن نے کہا۔

بوڑھا آدمی شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ ان جانوروں کو دیکھتا رہا، لیکن کچھ نہ بتا سکا۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہاں سے چلا آیا۔ جب تھوڑی دور تک گیا تو اس نے سوچا کہ چڑیا اسے بڑی گہری نظر سے دیکھ رہی تھی۔ ہو نہ ہو وہی میرا بیٹا ہے۔ پس وہ پھر جن کے پاس آیا اور التجا کی کہ وہ اسے پھر سے کوشش کرنے کا موقع دے۔

جن زیرِ لب مسکرایا اور تین۳ دوسرے پرندے یعنی تیتر، ہُدی اور بلبل لاٹھی پر بنی ہوئی چھتری پر بٹھا لایا۔ بوڑھا آدمی حسبِ سابق انھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا، لیکن کسی کو بھی نہ پہچان سکا اور روتا ہوا گھر کو واپس لوٹا۔ جب وہ گھر پہنچا تو اس نے پھر سوچا کہ "مجھے سب خطرے مول لے کر ایک پرندے کو ضرور منتخب کر لینا چاہیے"۔

وہ جن کے پاس پھر گیا۔ آخری کوشش کے لیے پھر التجا کی۔ جن نے منظور کر لی۔ اس دفعہ جن نے ایک فاختہ، ایک چڑیا اور ایک ہُدہُد چھتری پر بٹھا رکھے تھے۔ اس نے بوڑھے سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو پہچان کر لے جائے۔ بوڑھا بڑی گہری نظروں سے ان تینوں پرندوں کو دیکھتا رہا، پھر اس نے فاختہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملاتے ہوئے دیکھے، جو اُسے ٹک ٹک تک رہی تھی۔

"یہی وہ پرندہ ہے، جس میں میرے بچّے کی رُوح ہے"۔ اس نے دل میں سوچا اور اسے پکڑ لیا۔ جونھی اس نے فاختہ کو پکڑا تو اس نے دیکھا کہ وہ بجائے فاختہ کے اپنے بیٹے کو کندھے سے پکڑ رہا ہے اور جن اچانک غائب ہو گیا۔

بوڑھے باپ کو اپنے ننانوے۹۹ بیٹوں کی شادی پر اِتنی خوشی نہیں ہوئی تھی، جتنی کہ اس کے بیٹے کے زندہ و سلامت گھر پہنچنے پر مسرّت حاصل ہوئی۔



کچھ کہو کچھ سنو

خورشید احمد وارثی ـــ سکھر

س: آج کے دَور میں نیک انسان کی پہچان؟

ج: نیک انسان وہ ہے جو نیکی کی پہچان پوچھے!

خالد پرویز احمدی ـــ کراچی

س: ہمدرد نونہال کی تاریخ پیدائش؟

ج: اب سے گیارہ سال پانچ مہینے پہلے تمھارا نونہال اس دنیا میں آیا۔ اب بتاؤ، تم اس سے کتنے بڑے ہو؟

عبدالمجید فاروقی ـــ میانوالی

س: اچھی صحت بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

ج: نونہال میں صحت و تن درستی کے متعلق جو مضامین شائع ہوتے ہیں، اُنھیں غور سے پڑھو۔

سلیم صابر ـــ کوہاٹ

س: دُنیا کا سب سے گہرا سمندر کون سا ہے؟

ج: دُنیا کا سب سے گہرا سمندر بحرالکاہل ہے۔

غلام حسین ہاشمی ـــ پنڈی گھیب

س: کیا آپ کراچی کی سیر بذریعہ نونہال کرا سکتے ہیں؟

ج: ضرور، تمھاری فرمائش ضرور پوری کریں گے۔

سید شکیل احمد بہاری ـــ جہلم

س: آپ ہمدرد نونہال میں اچھے ڈرامے کیوں نہیں شائع کرتے؟

ج: نونہال میں اچھے ڈرامے شائع ہوتے

رہتے ہیں، اس مہینے بھی ایک ڈراما شامل ہے۔

نفیس احمد ـــــ چاٹگام

س : ہمدرد نونہال ہر ماہ کتنی تعداد میں شائع ہوتا ہے ؟

ج : نونہال اتنی تعداد میں شائع ہوتا ہے کہ پاکستان کے تمام پڑھنے کے شوقین بچے اسے پڑھ لیتے ہیں۔

ارشد زماں ـــــ کراچی

س : انسان اور حیوان میں فرق ؟

ج : وہی فرق ہے جو پہلے زمانے کے انسان اور آج کل کے انسان میں ہے۔

مظہر سعید ـــــ کراچی

س : بھائی جان، کوئی اچھی سی نصیحت کیجیے۔

ج : پہلے میں باعمل ہو جاؤں تو پھر تمھیں نصیحت کروں۔

اللہ بچایو انصاری ـ ٹنڈو محمد خان

س : ہمدرد نونہال میں اسلامی اور تاریخی مضمونوں کی کمی کی وجہ ؟

ج : پاکستان میں تم جیسے نونہالوں کی کمی۔

یوسف گوڈیل شفا ـ کراچی

س : دنیا میں سب سے بڑا تباہ کن زلزلہ کہاں آیا تھا ؟

ج : ۱۵۵۶ء میں چین میں آیا تھا، جس میں تقریباً آٹھ لاکھ تیس ہزار افراد مرے۔

کوثر علی خان ـــــ لاہور

س : ریڈیو پاکستان کے اسٹیشن کہاں کہاں ہیں ؟

ج : کراچی، لاہور، پشاور، راولپنڈی، ڈھاکہ، حیدر آباد، چٹاگانگ، راجشاہی اور کوئٹہ۔

سیفی غازی ـــــ بمبئی

س : اگر میں سالانہ خریدار بننا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا ؟

ج : اپنے کسی پاکستانی دوست کو لکھو کہ وہ ہمیں آٹھ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج دے۔ تمھیں سال بھر تک گھر بیٹھے نونہال ملتا رہے گا۔

محمد اسلم آزاد ـــــ حیدر آباد

س : زندگی ـــ اپنے لیے کیا اور دوسروں کے لیے کیا ؟

ج : دوسروں کی خدمت، اپنی عزت۔

کے۔ ایم۔ یونس ـــــ سکھر

س : بھائی جان، ٹیلی وژن کس نے ایجاد کیا ؟

ج : ٹیلی وژن ۱۹۲۶ء میں بیرڈ نے ایجاد کیا تھا۔

محمد اختر متین ـــ کوٹ سمابہ

س : کوڈک کیمرا کب اور کس نے ایجاد کیا ؟

ج : کیمرا ایسٹ مین ڈاکر نے ۱۸۸۸ء میں ایجاد کیا تھا۔

نونہال ادیب



چالاک درزی

سعید احمد کریمی
ٹھٹہ



ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی گاؤں میں ایک درزی رہتا تھا۔ اس کا نام سلیمان تھا۔ ہاں تو سلیمان درزی سیتا بہت اچھا تھا۔ تمام گاؤں میں اس کی سلائی مشہور تھی۔ گاؤں کے امیر امیر لوگ تمام کپڑے اسی سے سلواتے۔ یوں تو سلیمان درزی بہت اچھا سیتا تھا، مگر عام لوگوں کو اس سے صرف ایک شکایت تھی کہ وہ کپڑا ضرور بچاتا تھا۔

اس کی خاص بات یہ تھی کہ وہ کم کپڑے میں بھی اچھا سی دیتا تھا تو سلوانے والے کو شکایت کا موقع نہ ملتا اور درزی کے بچے کبھی کوئی کپڑا پہنتے کبھی کوئی۔ گاؤں کے لوگ یہ جانتے ہوئے بھی اسی سے کپڑے سلواتے۔

ایک دفعہ اُسی گاؤں کا ایک امیر

آدمی شہر گیا۔ وہاں سے اپنے لڑکے کے لیے اچھا سا کپڑا لایا۔ جب سلیمان درزی کو دینے لگا تو خیال آیا کہ اتنا بڑھیا کپڑا درزی ضرور بچالے گا۔ اس کے دماغ میں ایک بات آئی۔ اُس نے درزی کو اپنے گھر آنے کو کہا، خیر سلیمان درزی مان گیا جب درزی اُس کے گھر آیا تو امیر آدمی نے وہ ہی کپڑا درزی کو دے دیا اور کہا کہ میرے لڑکے کا قمیص سی دو۔ اور امیر آدمی اُسی کے پاس بیٹھ گیا اور تمام وقت وہیں بیٹھا رہا، جب تک درزی قمیص سیتا رہا۔ ابھی درزی نے قمیص پوری نہ کی تھی کہ اس کا لڑکا آیا اور اپنے باپ سے کہنے لگا، "ابا کھانا کھا لیجیے، ہم سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" سلیمان درزی نے منہ اٹھا کر کہا، "میں آج گھر پر کھانا نہیں کھاؤں گا۔" خیر لڑکا چلا گیا اور سلیمان درزی بڑی محنت سے قمیص سیتا رہا۔ اس کا بیٹا پھر آیا، بولا، "اباجان ایک آدمی گھر پر آپ سے ملنے آیا ہے۔" درزی نے جواب دیا کہ "اس سے کہہ دو کہ میں آج نہیں مل سکوں گا۔" اس کا بیٹا پھر چلا گیا۔ سلیمان درزی قمیص سیتا رہا اور اس کا مالک پاس ہی بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد درزی کا لڑکا پھر آیا اور درزی سے کہنے لگا، "اباجان دکان پر چند گاہک آئے ہوئے ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

درزی اس مرتبہ زور سے چیخا اور اپنا ایک جوتا اپنے لڑکے کے سر پر دے مارا اور کہا چلے جاؤ! کہہ دو میں آج کسی سے نہیں مل سکوں گا۔ خیر شام سے پہلے قمیص سل گیا اور امیر آدمی مطمئن ہو گیا۔

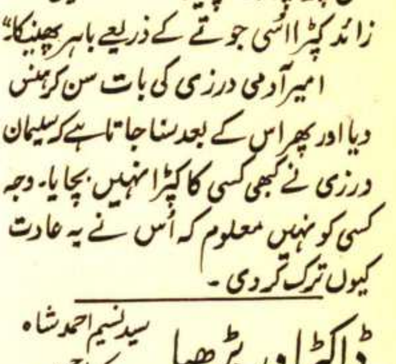
دوسرے دن جب امیر آدمی کا لڑکا وہ قمیص پہن کر بازار گیا۔ تو دیکھتا ہے کہ درزی کا لڑکا اُسی کپڑے کا قمیص پہنے ہوئے ہے۔ وہ بڑا حیران ہوا اور اپنے باپ کے پاس گیا اور ساری بات بتا دی۔ امیر آدمی بھی بہت حیران ہوا۔ سوچنے لگا کہ تمام وقت تو وہ اس کے سامنے بیٹھا رہا اور درمیان میں بھی درزی باہر نہیں گیا، لیکن پھر بھی وہ کپڑا بچا کر لے گیا اور کیسے لے گیا۔ وہ یہ سوچتے سوچتے درزی کے پاس پہنچا اور کہنے لگا، "بھائی درزی تمھارے ہاتھ کی صفائی کو تو مانتے ہیں، مگر یہ تو بتاؤ کل تم نے کپڑا کیسے پار کیا؟ جب کہ میں تمام وقت تمھارے پاس تمھاری نگرانی کرتا رہا۔"

درزی نے جواب دیا آپ پوچھتے ہیں تو بتا دیتا ہوں، "کل آپ کے سامنے میرا لڑکا مجھے تین مرتبہ بلانے آیا تھا۔ آخر میں جب وہ آیا تھا تو میں نے غصّے میں اس پر اپنا جوتا پھینک مارا تھا۔ میں نے زائد کپڑا اُسی جوتے کے ذریعے باہر پھینکا۔"

امیر آدمی درزی کی بات سن کر ہنس دیا اور پھر اس کے بعد سنا جاتا ہے کہ سلیمان درزی نے کبھی کسی کا کپڑا نہیں بچایا۔ وجہ کسی کو نہیں معلوم کہ اُس نے یہ عادت کیوں ترک کر دی۔

ڈاکٹر اور بڑھیا

سید نسیم احمد شاہ
کراچی



ایک بڑھیا کی آنکھیں اس قدر کمزور ہو گئی تھیں کہ اسے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ چناں چہ اس نے ایک ڈاکٹر کو بلایا اور گواہوں کے سامنے یہ اقرار کیا کہ اگر میری آنکھیں اچھی ہو گئیں اور پہلے کی طرح سب کچھ نظر آنے لگا تو میں تمھیں کافی رُپیہ دوں گی، لیکن اگر فائدہ نہ ہوا تو تم ایک پائی کے بھی حق دار نہ ہوگے۔

یہ بات طے ہو گئی اور ڈاکٹر نے علاج شروع کر دیا۔ جب کبھی ڈاکٹر بڑھیا کی کی آنکھوں میں دوا ڈالنے آتا تو ہر دفعہ اس کی کوئی نہ کوئی چیز اٹھا لے جاتا، یہاں تک کہ اس نے چوری چھپے بڑھیا کا سارا سامان لے جا کر اپنا گھر بھر لیا۔ جب بڑھیا کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں تو اس نے دیکھا کہ اس کا گھر خالی ہے۔ اس نے سوچا کہ اب تو ڈاکٹر کو ایک پائی بھی نہ دوں گی۔ ڈاکٹر بار بار رُپیہ مانگنے لگا، لیکن جب بڑھیا انکار کرنے لگی تو ڈاکٹر نے مقدمہ دائر کر دیا اور وہ دونوں عدالت میں حاضر ہوئے۔

بڑھیا نے حاکم کے سامنے یہ بیان دیا کہ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں ویسی کی ویسی اندھی رہی تو ایک پائی بھی نہ دوں گی۔ اب اس شخص کا بیان ہے کہ میری آنکھیں اچھی ہو کر بالکل ٹھیک ہو گئی ہیں، لیکن میں اس کے برخلاف یقین سے کہتی ہوں کہ

میں اب بھی اندھی ہوں، کیوں کہ جب میری آنکھیں خراب ہوئی تھیں تو میں اپنے گھر میں مختلف چیزیں اور قیمتی سامان دیکھتی تھی، مگر اب اگر چہ یہ شخص قسم کھا کر کہتا ہے کہ میری آنکھیں درست ہو گئیں ہیں تو پھر بھی میں ہرگز اس کی بات پر یقین نہیں کر سکتی، کیوں کہ مجھے گھر میں ایک چیز بھی نظر نہیں آتی ہے۔

ایک شاعر اور بادشاہ

جلیل احسن صابر
کیمبل پور



ایک عربی شاعر "ابودلامہ" بہت ہی مسخرا اور با مذاق آدمی تھا۔ ایک دن وہ ایک قصیدہ لکھ کر خلیفہ المہدی کے دربار میں حاضر ہوا اور قصیدہ سنانے کی اجازت چاہی۔ خلیفہ نے اجازت دے دی اور جب ابودلامہ قیصدہ پڑھ چکا تو خلیفہ نے کہا، اے ابودلامہ تمھارا قصیدہ بہت ہی پسند آیا۔ مانگو تم کیا چاہتے ہو؟ ابودلامہ نے کہا، حضور مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ سوائے ایک شکاری کتے کے۔ بادشاہ کو بڑی حیرت ہوئی کہ تو شکاری کتے کے سوا اور کوئی چیز کیوں نہیں مانگتا۔ ابودلامہ نے کہا، حضور کتے کی ضرورت تو مجھے ہے آپ کو تو نہیں۔ خلیفہ نے کہا کہ اسے ایک شکاری کتا دیا جائے۔ ابودلامہ نے کہا، حضور جب میں شکار کے لیے جایا کروں گا تو کیا پیدل ہی جایا کروں گا؟ خلیفہ نے کہا، ٹھیک ہے اسے ایک گھوڑا بھی دیا جائے۔ ابودلامہ نے کہا، حضور اس گھوڑے کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ خلیفہ نے کہا کہ اسے سواری کے گھوڑے کے ساتھ ایک سائس بھی دیا جائے۔ ابودلامہ نے کہا، حضور جب میں شکار سے واپس آیا کروں گا تو پھر شکار کون پکایا کرے گا؟ خلیفہ نے کہا کہ اسے ایک لونڈی بھی دی جائے جو اس کا کھانا وغیرہ تیار کرے گی۔ ابودلامہ نے کہا یہ سب کچھ آپ کی مہربانی سے ہو گیا، مگر حضور میں رات کو کہاں بسیرا کروں گا۔

خلیفہ نے کہا کہ اسے ایک مکان بھی رہنے کے لیے دیا جائے۔ ابودلامہ نے کہا، "اے میرے آقا آپ نے مجھے اِن تمام چیزوں سے گھر والا تو بنا دیا، مگر میں ان کے لیے اخراجات کہاں سے لاؤں گا؟ خلیفہ نے کہا، ابودلامہ کے نام سو آباد اور اتنے ہی بنجر مربّعے لکھ دیے جائیں۔ ابودلامہ نے کہا، یہ بنجر اور آباد کیا ہوتے ہیں؟ خلیفہ نے کہا آباد وہ ہوتے ہیں جن میں کاشت وغیرہ ہوسکے۔ اور بنجر وہ ہے کہ جن میں کاشت نہ ہوسکے۔ ابودلامہ نے کہا، تو حضور پھر میں عراق کے ہزاروں بنجر مربّعے آپ کے نام لکھ دیتا ہوں۔ یہ سُن کر خلیفہ اتنا ہنسا کہ پیٹ میں بل پڑنے لگے۔ جب ہنسی کم ہوئی تو خلیفہ نے کہا، ابودلامہ تو کتنا پُرمذاق ہے۔ اچھا اس کے نام آباد مربّعے لکھے جائیں۔

رحم دل بادشاہ

عبدالستار عادل
گوادر



ملک کے ایران میں ایک رحم دل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ باپ کی طرح اس کی لڑکی بھی رحم دل تھی۔ بادشاہ دربار کا کام کر کے ہمیشہ آنسو بہایا کرتا تھا۔ شہزادی نیلوفر ہمیشہ بادشاہ سے رونے کا راز معلوم کرتی، لیکن بادشاہ نے اسے راز نہ بتایا۔ آخر ایک روز شہزادی کے اصرار پر اس نے اُسے وہ کہانی سنانی شروع کی، جس پر وہ آنسو بہایا کرتا تھا۔

پہلے پہل ہم اولاد سے محروم تھے۔ آخر دعاؤں اور تعویذوں سے ہمارے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس دن تمام ملک میں چراغاں کیا گیا۔ قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ یتیموں اور فقیروں میں کھانا تقسیم کیا گیا۔ غرض ملک کا ہر فرد خوش و خرم نظر آرہا تھا۔

مگر کیا معلوم تھا کہ یہ دن خوشی کے بجائے غم میں تبدیل ہوجائے گا۔ نجومیوں نے کہا کہ یہ بڑا ہو کر آپ کا دشمن بن جائے گا۔ اسے دریا میں بہا دو۔ ہم نے اس کو ایک آرام دہ ٹوکری میں بٹھا کر خود اپنے ہاتھوں سے اپنے لختِ جگر کو دریا میں چھوڑ دیا۔ جب تک وہ ہمیں نظر آتا رہا۔ اُسے ہم

دیکھتے رہے، آج اس واقعہ کو بیس سال ہو چکے ہیں۔ وہ جب بھی مجھے یاد آتا ہے تو بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔

شہزادی نیلوفر نے کہا جب تک میں اپنے بھائی کو نہ پا سکوں گی، چین سے نہ بیٹھوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور زندہ ہے۔

اور وہ اسی رات ایک گھوڑے پر سوار ہو کر دریا کے کنارے کنارے گھوڑے کو دوڑاتی ہوئی جا رہی تھی۔ آخر پانچویں دن اُسے ایک شخص ملا، جو گھوڑے کو دوڑاتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے فوراً اُسے روک لیا اور اس سے پوچھا، کہ تم کون ہو، اس نے کہا کہ میں ایک ڈاکو ہوں اور میرا نام سلطان ڈاکو ہے اور اس سے کہا کہ آگے میرے ساتھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ شہزادی نے اس کے گلے میں ایک تعویذ دیکھا، شہزادی نے کہا، اس تعویذ میں کیا لکھا ہے۔ اس نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا، اُسے آپ ہی پڑھ کر مجھے سنائیں۔ شہزادی نے تعویذ پڑھا تو بے اختیار اس کے گلے سے لپٹ کر کہا کہ بھیا تم میرے بھائی ہو اور میں تمھیں ڈھونڈھنے کے لیے یہاں تک آئی ہوں۔ تم ایک شہزادے ہو اور اس پر شاہی مہر لگی ہوئی ہے۔ اور وہ اُسے شاہی محل میں لے گئی، بادشاہ اُس کو اور شہزادے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور سب ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔

چوری کرنا بری بات ہے

فریدہ نسرین



ابھی جاوید کی عمر ۶ سال کی تھی، لیکن وہ بہت ہی شرارتیں کیا کرتا تھا۔ وہ بہت ہی نٹ کھٹ شریر لڑکا تھا۔ اس کی امّی جاوید کی شرارتوں سے تنگ آ چکی تھیں۔ جاوید کو ان کی امّی نے ایک اچھے اسکول میں داخل کروا دیا، لیکن وہاں بھی جاوید پڑھنے لکھنے کے بجائے شرارتیں کیا کرتا تھا۔ اُس نے

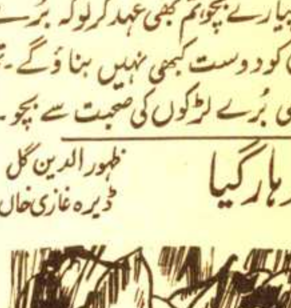
بُرے لڑکوں کو دوست بنالیا ہر وقت اُنھیں لڑکوں کے ساتھ بیٹھتا تھا، جس کی وجہ سے اس کی عادتیں اور بگڑ گئیں۔ اُس نے چوری کرنا بھی سیکھ لیا تھا، لیکن اُس کی امّی اُس کی اِس عادت سے بے خبر تھیں۔ جاوید کے دوست اس سے کہتے تھے کہ تم بھی اپنے گھر سے پیسے لے کر آیا کرو تو ہماری طرح مزے مزے کی چیزیں کھانے کو ملیں گی۔ جاوید کو شروع شروع تو بہت ڈر محسوس ہوا، لیکن ایک بار امّی کے رکھے ہوئے پیسے حاصل کرنے میں کامیابی ہوگئی۔ جس کی وجہ سے اس کی عادت پختہ ہوگئی۔ اب تو وہ بڑی آسانی سے امّی کے رکھے ہوئے پیسے لے لیا کرتا تھا اور سارے پیسے لے جاکر اپنے دوستوں کو دے دیتا، کیوں کہ وہ اپنے دوستوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ایک دفعہ اس کے سب سے بڑے دوست نے کہا، "جاوید ہم لوگوں کو آج کل کہیں سے پیسے نہیں مل رہے ہیں تم اپنے گھر سے لے کر آؤ۔" یہ بات سن کر جاوید چپ ہو گیا، پھر سوچنے لگا کس طرح امّی کے رکھے ہوئے پیسوں کو حاصل کیا جائے۔ وہ نئی نئی ترکیبیں سوچنے لگا۔ چھٹی ہونے کے بعد جاوید سیدھا گھر گیا اور ہر جگہ پیسوں کو تلاش کرنے لگا۔ کیوں کہ ان کی امّی سودے کے پیسے ہر کہیں جگہ رکھ دیتی تھیں، جاوید پیسوں کو تلاش ہی کر رہا تھا کہ اس کی نظر الماری پر پڑ گئی، جہاں امّی نے دو رُپے رکھے تھے اس نے فوراً وہ رُپے اٹھا لیے۔ اتفاق سے اُس کی امّی نے جاوید کو رُپے اٹھاتے ہوئے دیکھ لیا اور فوراً اُسے پکڑ لیا، کہنے لگیں، "اچھا تو یہ آپ کی حرکت ہے، جبھی میرے پیسے برابر غائب ہوتے رہتے ہیں تم نے اب یہ عادت بھی سیکھ لی ہے، ٹھہرو تمھاری خبر لیتی ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے جاوید کی پٹائی کرنا شروع کر دی اور کہنے لگیں توبہ کرو کہ میں آئندہ چوری نہیں کروں گا ورنہ میں تمھیں بہت ماروں گی، تمھارے ابّا سے خوب پٹواؤں گی۔ یہ سن کر جاوید کو بہت ڈر محسوس ہوا، کیوں کہ کئی بار جاوید کے ابّا نے اسے بہت بُری طرح مارا تھا۔ جاوید کی امّی جاوید کو سمجھا رہی تھیں، جاوید بیٹے تم چوری کیوں کرتے ہو۔ چوری کرنا بہت بری بات ہے۔ تم سے چوری کرنے کو کون کہتا ہے۔ اس پر

جاوید نے جواب، "میرے دوست مجھ سے کہتے ہیں، تم اپنے گھر سے پیسے لے کر آیا کرو اس وجہ سے میں گھر سے پیسے لے کر جاتا ہوں، لیکن امی آج سے میں توبہ کرتا ہوں کہ اب کبھی چوری نہیں کروں گا ہاں امّی چوری کرنا بری بات ہوتی ہے۔" امی بولیں آج سے تم توبہ کر لو کہ بُرے لڑکوں سے کبھی دوستی نہیں کروگے، کیوں کہ بُرے لڑکے بُرے کام کرنا بتاتے ہیں، بُرے لڑکوں کی صحبت سے بچو، جاوید نے آج سے توبہ کر لی کہ اب کبھی بُرے لڑکوں سے نہیں بولوں گا۔

پیارے بچّو تم بھی عہد کر لو کہ بُرے لڑکوں کو دوست کبھی نہیں بناؤ گے۔ تم لوگ بھی بُرے لڑکوں کی صحبت سے بچو۔

شیر ہار گیا

ظہور الدین گل
ڈیرہ غازی خاں



ایک دن ایک کسان اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ وہیں ایک بھوکا شیر بھی جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا اور کسان کے موٹے تازے بیلوں کو پیاس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جھٹ جھاڑیوں سے باہر نکل آیا اور کسان کے پاس پہنچ کر کہنے لگا، "مجھے اللہ تعالیٰ نے تمھارے بیل کھانے کو یہاں بھیجا ہے۔" کسان نے جب شیر کو سامنے کھڑے دیکھا تو تھر تھر کانپنے لگا، پھر حوصلے سے جواب دیا، "بھائی یہ بیل میں تمھیں کیسے دے سکتا ہوں؟ انھیں سے تو میرا گزارہ ہوتا ہے۔" شیر نے کہا، "میں کچھ نہیں جانتا، کیوں کہ میں اس وقت بھوک سے بے تاب ہو رہا ہوں مجھے جلدی سے ایک بیل دے دو۔" کسان نے جب دیکھا کہ شیر کسی طریقے سے بھی نہیں ٹلتا تو کہا، "میرے پاس ایک بہت ہی موٹی گائے ہے۔ تم میرے بیلوں کا خیال کرو۔ میں اُسے لے کر ابھی آتا ہوں۔" شیر نے کہا، "اچھا جلدی جاؤ۔ اگر زیادہ دیر کی تو میں بیلوں کو کھا جاؤں گا۔"

کسان جلدی جلدی گھر پہنچا۔ کسان کی بیوی نے پوچھا، "آج اتنی جلدی کیوں آ گئے ہو؟ کیا کام ختم ہو گیا؟" کسان نے تمام واقعہ بیوی کو سنایا اور کہا کہ کہیں سے ایک

بھوکا شیر آگیا ہے وہ بیلوں کو کھانا چاہتا ہے، لیکن میں نے اُسے اپنی گائے دینے کا وعدہ کیا ہے۔" اس کی بیوی بہت عقل مند تھی۔ اس نے کہا، "اگر تم گائے اُسے دے دوگے تو بچے دودھ کہاں سے پئیں گے؟ ہمیں گھی اور مکھن کہاں سے ملے گا؟" کسان نے جواب دیا اور اگر اس نے بیل کھا لیے تو ہم زمین میں ہل کہاں سے چلائیں گے اور پھر فصل کیسے اُگے گی؟" کسان کی بیوی نے کہا، "اچھا تم کھیتوں میں جاؤ اور شیر سے کہو کہ میری بیوی گائے لے کر آرہی ہے۔" کسان اسی وقت کھیتوں کو چلا گیا۔

شیر نے جب کسان کو بغیر گائے کے آتے دیکھا تو بولا، "کیوں؟ گائے کیوں نہیں لائے؟" کسان بولا، "چند منٹ اور انتظار کرو۔ میری بیوی ابھی لے کر آتی ہی ہوگی۔" شیر بہت بھوکا تھا۔ پھر بھی اس نے چند منٹ اور انتظار کیا۔ اُدھر کسان کی بیوی مردانہ لباس پہن کر اور ایک سفید گھوڑے پر سوار ہو کر کھیت میں آپہنچی اور اونچی آواز میں کہنا شروع کیا، "میرے خیال میں مجھے آج اس کھیت میں ایک شیر ضرور ملے گا۔ میں اُس کا شکار کروں گا اور خوب مزے سے کھاؤں گا۔ مجھے شیر کا گوشت بہت پسند ہے۔"

شیر بہت ہی بزدل تھا۔ جب اُس نے یہ گفتگو سنی تو ڈر کے مارے کانپنے لگا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

راستے میں اسے اس کا دوست گیدڑ ملا اور اُسے روک کر پوچھا، "دوست کیا بات ہے؟ کیوں اس طرح بے تحاشہ بھاگے جا رہے ہو؟"

شیر نے پھولے ہوئے سانس سے کہا، "دوست وہاں ایک ایسا عجیب و غریب انسان ہے، جو شیروں کا شکار کر کے اُن کا گوشت بہت ہی مزے سے کھاتا ہے۔"

شیر کی یہ بات سُن کر گیدڑ بہت ہنسا اور بولا، "واہ جنگل کے بادشاہ! ایک عورت سے ڈر کر بھاگ آئے! وہ تو کسان کی بیوی تھی۔"

مگر شیر نہ مانا، کہنے لگا، "اچھا میرے ساتھ آؤ میں تمھیں دکھاتا ہوں کہ وہ آدمی ہے یا کسان کی بیوی؟ تم میری دُم سے اپنی دُم باندھ لو۔"

وہ پھر دونوں وہاں گئے۔ کسان کی بیوی نے انھیں جھاڑیوں میں چھپے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے پھر پہلے کی طرح کہنا شروع کیا۔

شیر نے جب دوبارہ وہی الفاظ سنے تو وہ اور بھی خوف زدہ ہوگیا اور بے تحاشا بھاگنا شروع کردیا، گیدڑ نے اُسے لاکھ سمجھایا، لیکن شیر ڈر گیا تھا۔ گیدڑ کی دُم اس کی دُم سے بندھی ہوئی تھی۔ اس لیے بیچارے گیدڑ کی تو راستے میں ہی جان نکل گئی۔

اس طرح شیر نے ایک کسان کی عقل مند بیوی سے شکست کھائی اور کسان کی گائے اور بیل سب بچ گئے۔

اور شیر بیچارہ بُری طرح ہار گیا۔

واشنگٹن

راحت عثمانی۔ دہلی

ساتھیو! جیسا کہ تم سب کو معلوم ہوگا واشنگٹن امریکا کا سب سے پہلا صدر تھا اور اسی نے امریکا کو آزاد کرایا تھا۔ اُس کا یہ احسان امریکا کبھی نہیں بھول سکتا۔ آؤ آج تمھیں اسی کی سادگی کا ایک چھوٹا سا قصہ سنائیں۔

ایک دن واشنگٹن معمولی لباس پہنے گھوڑے پر سوار ہوکر نکلا جس سے وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اُس نے دیکھا کہ کچھ سپاہی ایک بہت بھاری لکڑی کا لٹھا اٹھا رہے تھے، جو کہ ان سے نہیں اٹھ رہا تھا اور ان کا سردار اپنے گھوڑے پر بیٹھا انھیں حکم دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا "اٹھاؤ، اٹھاؤ۔ دھکا دو، لے جاؤ"۔ واشنگٹن اپنے گھوڑے پر سے اترا اور اتر کر اُن کے سردار سے کہا، "تم اُن کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ اور اُن کو صرف تمھاری مدد کی ضرورت ہے"۔ اُن کے سردار نے نفرت سے منھ پھیر لیا اور حقارت سے کہا، "تم مجھے نہیں جانتے، میں کون ہوں؟ میں ان کا سردار ہوں"۔ واشنگٹن نے اس سے کہا، "جناب میں معافی مانگتا ہوں میں نہ جانتا تھا کہ آپ کون ہیں"، اور یہ کہہ کر اس نے اُن لوگوں کی مدد کی۔ اس کی مدد سے وہ لکڑا اٹھانے میں کام یاب ہوگئے، کیوں کہ ان کو صرف ایک ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ واشنگٹن نے اپنا کوٹ پہنا اور یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ "میں تمھارا ابھی افسر ہوں"

واشنگٹن کے جانے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ وہ دراصل واشنگٹن تھا وہ دل میں بہت شرمندہ ہوا وہ چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور سما جائے۔

تمھارا خیال ہے



سال

جیسے ہی میں اسکول سے گھر میں داخل ہوا، ہمدرد نونہال پر نظر پڑی - ایسا بہترین پرچہ نکالنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے - فروری کا پرچہ اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا - کہانیوں میں "سلیم نے ساٹھ اشرفیاں کمائیں" اور "دِل جیتنے والا تحفہ" بہت پسند آیا - اگر آپ اس رسالہ کا ایک سالنامہ بھی نکالا کریں تو بہت اچھا ہو - قسط وار کہانی "شیر ببر جو افریقی جنگل کا بادشاہ تھا" وہ بھی بہت پسند آئی -

انجم توحید صدیقی - لاڑکانہ

پُرانا خریدار ہوں

میں آپ کے رسالے کا تقریباً ۸ سال سے خریدار ہوں - ہمیشہ بڑی دل چسپی سے پڑھتا ہوں اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن پا رہا ہوں - یہ رسالہ پاکستان بھر میں انفرادی حیثیت کا حامل ہے - پچھلے پرچوں کی کیا تعریف کروں - جنوری اور فروری کے شمارے دیکھ کر بے اختیار منہ سے واہ نکل پڑی اور خاص کر اس دفعہ آپ نے رسالے کو چار چاند لگا دیے - ٹائٹل اتنا پیارا اور دل کش تھا کہ اس سے نظریں ہٹانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا - یہ صرف آپ ہی کی قابلِ قدر کوششوں اور محنتوں کا نتیجہ ہے -

آپ نے سائنسی اور جغرافیائی مضامین رسالے میں دے کر ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس دفعہ کے مضامین اور نظمیں تو بہت ہی پسند آئے۔

طارق رفیق بٹ حیدر آباد

حسین سرورق

فروری ۱۹۶۵ء کا "ہمدرد نونہال" ابھی ابھی ملا ہے۔ ٹائٹل سے نظر ہٹانے کو دل نہیں چاہتا۔ آرٹسٹ کو مبارکباد۔ تمام مضامین بھی اپنی جگہ خوب ہیں۔ ہر لحاظ سے یہ بچوں کے لیے بہترین رسالہ ہے۔

عزیز اختر۔ نئی دہلی

بچوں کی تصویریں

میں ہمیشہ نونہال پڑھتا ہوں، بہت پسند آتا ہے۔ مجھے "بچوں کا طرحی مشاعرہ" بہت پسند آیا۔ صوفی تبسم صاحب کو مبارکباد پیش کیجیے گا۔

فروری کے نونہال میں "سلیم نے ساٹھ اشرفیاں کمائیں" اور "شیر ببر جو افریقی جنگل کا بادشاہ تھا" بے حد پسند آیا۔ میری یہ رائے ہے کہ آپ اس نونہال میں بچوں کی تصویریں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر دیں۔ میری ہمیشہ یہ دعا ہے کہ نونہال اور ترقی کرے۔

سید شفقت علی۔ کراچی

دل پسند رسالہ

فروری کا رسالہ دیکھا۔ بے حد حسین اور خوب صورت تھا۔ جب اندر سے کھول کر دیکھا تو دل باغ باغ ہوگیا۔ ہمدرد نونہال، پاکستانی بچوں کا پیارا اور دل پسند رسالہ ہے۔ کہانیوں میں "ایک لکڑہارا اور گڑیا"، "سلیم نے ساٹھ اشرفیاں کمائیں"، "نونہال ادیب" اور "اغوا" خوب صورت کہانیاں تھیں۔ نظم "عید" اور "جگنو چمک رہا ہے" بہت پسند آئیں (سریرگل، کاکاخیل)

پسندیدہ مضامین

مجھے فروری کا رسالہ ملا، جس کا ٹائٹل بڑا شان دار تھا، دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ مندرجہ ذیل مضامین بہت پسند آئے۔ "ایک لکڑہارا اور گڑیا" "سلیم نے ساٹھ اشرفیاں کمائیں"۔ (ارشد زماں۔ کراچی)

دل چسپ مضامین سے پُر

فروری کا شمارہ ہاتھ آیا تو اس طرح پڑھنے لگا جیسے کسی مضمون کا آج امتحان ہو اور ساری کتاب رٹنی ہو۔ آپ کا رسالہ واقعی لاجواب ہے۔ ہیرا، نسیان، سیپیاں اور گھونگھے جمع کرنا، جیٹ طیارے، طرح طرح کے گھر، اغوا اور بچوں کے بھولے بھالے لطیفے بہت پسند آئے۔ اگر آئندہ سال سے سال نامہ بھی شائع کریں تو بہت بہتر ہوگا۔ (شوکت حسین عبداللہ۔ کراچی)

سرورق

فروری ۱۹۶۵ء کا ہمدرد نونہال پڑھا۔ بہت ہی پسند آیا۔ خاص کر ٹائٹل دیکھ کر تو باچھیں ہی کھل گئیں اب تو یہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول فرمایئے۔ (حبیب الرحمٰن۔ نوشہرہ کلاں)

بچوں کا بہترین رسالہ

یہ دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی، کہ ہمدرد نونہال تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ رسالے میں آپ بچوں کے ذوق و شوق کا خیال رکھتے ہوئے جو معلوماتی مضامین، اچھی نظمیں اور دل چسپ کہانیاں پیش کرتے ہیں، وہ قابلِ ستائش ہیں۔ خاص کر بچوں کا اخبار "ننھے ادیب" بے حد عمدہ ہوتے ہیں۔ آپ ایسا عمدہ رسالہ بچوں کے لیے شائع کر کے اردو ادب کی بے پایاں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ میں یہ کہتے ہوئے کچھ جھجک محسوس نہیں کرتا کہ ہمدرد نونہال ہی وہ رسالہ ہے جو پاکستانی بچوں کا واحد بہترین رسالہ کہلانے کا مستحق ہے۔

صدیق یونس صابر۔ گوادر، مکران

خوشی ہوئی

ہمدرد نونہال، بڑی انتظار کے بعد ملا۔ پڑھ کر بہت ہی خوشی ہوئی۔ مندرجہ ذیل مضامین بہت پسند آئے۔ "سلیم نے ساٹھ اشرفیاں کمائیں، سیپیاں اور گھونگھے جمع کرنا، اخبار نونہال، نونہال ادیب، بچوں کے بھولے بھالے لطیفے، پوری کی پوری کہانی، دل جیتنے والا تحفہ، تیندوے کی دوستی۔

عبدالمجید فاروقی۔ میانوالی

لکھنے والوں کو مبارک

میں ہر ماہ ہمدرد نونہال کا مطالعہ کرتی ہوں جب ہمدرد نونہال ملا، تو دل سے بے ساختہ دُعا نکلی۔ ٹائٹل بہت پسند آیا۔ آرٹسٹ صاحب کو میری طرف سے مبارک باد دیں۔ میں نے فوراً ہی پورا رسالہ پڑھ ڈالا۔ خاص کر اغوا، مور خور، بچوں کے بھولے بھالے لطیفے، سلیم نے ساٹھ اشرفیاں کمائیں بہت پسند آئے۔ باقی مضامین بھی بڑے دل چسپ اور قابلِ تعریف تھے۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ میری طرف سے ان کے لکھنے والوں کو مبارک باد دیں۔

شہناز۔ سلہٹ

سائز اور سادگی

نونہال رسالہ کا پابندی سے مطالعہ کرنا میرے مشاغل میں شامل ہے۔ اتنا شان دار اور جامع، ہر لحاظ سے مکمل، ہر خوبی سے مزین بھرپور رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ رسالہ غیر معمولی اہمیت اور افادیت کا حامل ہے۔ سائز اور سادگی کے اعتبار سے بھی بڑی حد تک منفرد ہے۔ حقیقت میں آج کل ایسے خوب صورت اور معیاری رسائل دیکھنے میں ذرا کم ملتے ہیں۔ مضامین کی ترتیب و نفاست بڑی دل کش ہوتی ہے۔ آپ جس محنت اور لگن کے ساتھ رسالہ نونہال نکال رہے ہیں، اس کے لیے ہدیۂ تشکر پیش کرتی ہوں۔

عقیلہ ناز۔ کراچی

سب سے خوب صورت

مارچ ۱۹۶۵ء کا ہمدرد نونہال دیکھا۔

اس مرتبہ رسالے میں سب سے اچھے مضمون "دو چاند"، "ابن رشد"، "تار برقی کے موجد"، "بڑھیا جو شہر سے خوف زدہ تھی"، "برف کے پھول" سب بہت پسند آئے۔ اس مرتبہ کا ٹائٹل سب سے خوب صورت تھا۔ مصور صاحب کو میری طرف سے مبارک باد۔ (کلیم اشرف فاروقی۔ لاڑکانہ)

تمھارا خیال ہے

مارچ کا ہمدرد نونہال دیکھا، پڑھا اور داد دی۔ ٹائٹل نہایت حسین تھا۔ نہ جانے آپ ٹائٹل میں کون سا جادو بھر دیتے ہیں کہ بس دل چاہتا ہے کہ دیکھتے ہی رہیں۔

میں یہ کہنے سے گریز نہ کروں گی کہ ہمدرد نونہال کو حسین بنانے میں آپ نے نونہالوں کی خواہشات کا بہت احترام کیا ہے حقیقت میں یہ آپ کی نونہالوں سے محبت ہی کا نتیجہ ہے۔ غالباً، بلکہ حقیقت میں ہمدرد نونہال ہی واحد رسالہ ہے، جو نہایت حسین پھولوں کا گلدستہ ہے۔ ہم آپ کی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس دفعہ کے تمام مضامین بہت اچھے ہیں۔ بھیا! اگر ہو سکے تو اس حسین گلدستے کو سفید لبادہ ہی پہنا دیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اگر کاغذ بھی سفید ہوں تو بس مزہ ہی آجائے گا۔ بہر حال میں آپ کی کاوشوں کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔

بشریٰ مقبول صدیقی۔ لاہور

ترقی کی راہ پر

آج فروری کا ہمدرد نونہال کا تازہ پرچہ نظر سے گزرا۔ سرورق دیکھ کر باچھیں کھل گئیں۔ ہمیں بہت خوشی ہے کہ ہمارا محبوب ترین رسالہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس رسالے میں عید مبارک، ایک لکڑہارا اور گڑیا، آداب مجلس، سلیم نے ساٹھ اشرفیاں کمائیں، دل جیتنے والا تحفہ، اغوا قابلِ تعریف ہیں۔

عبدالقیوم عابد۔ گوجرانوالہ

کمی

پہلی بار "ہمدرد نونہال" آنکھوں سے گزرا۔ بہت ہی پسند آیا۔ گزشتہ سالوں سے میں نے جتنے رسائل کا مطالعہ کیا ہے، مگر ہمدرد نونہال جیسا کسی کو نہ پایا۔

رب العزت نے مجھے ایک ایسا انمول تحفہ دیا ہے، جو میرے حال کا دل چسپ ساتھی ہے۔ میری ہمیشہ یہی دعا رہے گی کہ اللہ جل شانہٗ اس کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

محمد اختر متین۔ کوٹ سمابوی



حلقۂ دوستی

عبدالحمید - حیدر آباد
عمر : ۱۴ سال — تعلیم : ہفتم
دل چسپیاں : مصوری - اسکاؤٹنگ وغیرہ
پتہ : نور اسلام ہائی اسکول لطیف آباد نمبر ۱ - حیدر آباد

انور حسین انور - خیر پور میرس
عمر : ۱۶ سال — تعلیم : نہم
دل چسپیاں : مطالعہ کرنا - تعلیم حاصل کرنا -
پتہ : نیو جنرل اسٹور - ڈاکخانہ کرونڈی - ضلع خیر پور میرس

امتیاز علی - ملتان چھاؤنی
عمر : ۱۷ سال — تعلیم : نہم
دل چسپیاں : ہاکی کھیلنا اور نونہال پڑھنا -
پتہ : سی - بی ہائی اسکول - ملتان چھاؤنی -

شکیل احمد - ڈھاکہ
عمر : ۱۳ سال — تعلیم : ہشتم
دل چسپیاں : ٹکٹ جمع کرنا - فٹ بال کھیلنا -
پتہ : ۱۶/۱۸ سکھ لال داس لائن - ڈھاکہ

سید محمد ضامن - کراچی
عمر : ۱۵ سال — تعلیم : دہم
دل چسپیاں : غیر ملکی اور پرانے سکے جمع کرنا -
پتہ : F-۳۹ کاظم منزل - رضویہ سوسائٹی - کراچی - ۱۸

سید ایوب علی نقوی - سندھ
عمر : ۱۳ سال — تعلیم : ہشتم
دل چسپیاں : نماز پڑھنا - اسلامی کتابیں پڑھنا -
پتہ : زرعی ترقیاتی بینک - ٹنڈو محمد خان - سندھ

سید ثاقب حسین۔ منٹگمری
عمر: ۱۰ سال تعلیم: پنجم
دل چسپیاں: رسالے پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ نماز پڑھنا
پتہ: فیض پور۔ ڈاک خانہ بائل گنج۔ تحصیل پاک پٹن ضلع منٹگمری

سید مقصود علی - کراچی
عمر: ۱۴ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ ٹکٹ جمع کرنا۔
پتہ: مکان نمبر ۵/۷۷۲ ڈرگ کالونی۔ کراچی

محمد جاوید - پشاور
عمر: ۱۲ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: تقاریر۔ مضامین لکھنا۔ مطالعہ کرنا
پتہ: جاوید برادرز۔ کمیشن ایجنٹ۔ پیپل منڈی پشاور

اذفر سلیم - کراچی
عمر: ۹ سال تعلیم: پنجم
دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا۔ ٹکٹ جمع کرنا۔ مطالعہ۔
پتہ: ۹/۶ بلاک اے ۴ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

ضیاء الدین ضیا۔ گوجرانوالہ
عمر: ۱۵ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: فوٹو جمع کرنا۔ مطالعہ کرنا۔
پتہ: مکان نمبر ۵۸۳/ح۔ گلی ۶ گورونانک پورہ گوجرانوالہ

نعیم الحق - سیالکوٹ
عمر: ۱۳ سال تعلیم: ششم
دل چسپیاں: کرکٹ کھیلنا۔ ٹکٹ جمع کرنا۔
پتہ: حق اسٹیشنری مارٹ۔ لہائی بازار۔ سیالکوٹ

فرخ سلیم - کراچی
عمر: ۱۵ سال تعلیم: فرسٹ ائر
دل چسپیاں: کرکٹ و ہاکی کھیلنا۔ ٹکٹ جمع کرنا
پتہ: ۹/۶ بلاک A، ۴ ناظم آباد۔ کراچی

خالد پرویز - کراچی
عمر: ۱۲ سال تعلیم: پنجم
دل چسپیاں: اخبار اور رسالوں کا مطالعہ۔
پتہ: معرفت فضل حق صاحب۔ فردوس کالونی کراچی

سرفراز احمد گوجرانوالہ
عمر: ۱۸ سال تعلیم: دہم
دل چسپیاں: قلمی دوستی کرنا۔ ہمدرد نونہال پڑھنا
پتہ: فیض منزل آبادی چاہ ملہیان والی۔ گلی حاجی غلام قادر۔ گوجرانوالہ ٹاؤن

سید عبدالقادر قادری۔ کراچی
عمر: ۱۲ سال تعلیم: ہشتم
دل چسپیاں: قلمی دوستی۔ فوٹو جمع کرنا۔
پتہ: مکان ۱/۲۲۱ یا ۱/۲۲۲ ڈرگ کالونی۔ کراچی

محمد خالد قادری۔ جھنگ
عمر: ۱۵ سال تعلیم: دہم

دل چسپیاں : پڑھنا اور مطالعہ کرنا۔ فٹ بال کھیلنا
پتہ : نذیر کالونی ۔ جھنگ صدر

محمد نواز ۔ کراچی
عمر : ۱۷ سال   تعلیم : ہفتم
دل چسپیاں : ہمدرد نونہال پڑھنا۔ اخبار دیکھنا۔
پتہ : بلاک نمبر ۷/۳ کوارٹر نمبر ۶۴۵ تاراچند روڈ کیماڑی ۔ کراچی

طارق یوسف ۔ لاہور
عمر : ۱۰ سال   تعلیم : پنجم
دل چسپیاں : ہمدرد نونہال اور دیگر رسالوں کا مطالعہ
پتہ : ۶ ۔ گارڈن ٹاؤن ۔ لاہور

سید معراج عباس ۔ کراچی
عمر : ۱۷ سال   تعلیم : دہم
دل چسپیاں : فٹ بال کھیلنا۔ ڈرائنگ بنانا۔
پتہ : کوارٹر نمبر D-۶/۱۹ پلاٹ نمبر ۱۴ ابیر کالونی ۔ کراچی

خورشید یوسف ۔ لاہور
عمر : ۱۳ سال   تعلیم : نہم
دل چسپیاں : قلمی دوستی اور ٹینس کھیلنا
پتہ : کے ۔ بی ۔ جوزف اینڈ کو ۔ گارڈن ٹاؤن لاہور

جاوید اقبال ۔ کراچی
عمر : ۱۲½ سال   تعلیم : ہفتم
دل چسپیاں : مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی
پتہ : جاوید گھی اسٹور ۔ ملیر سٹی ۔ کراچی نمبر ۲۳

محمد نثار عابد ۔ مردان
عمر : ۱۰ سال   تعلیم : چہارم
دل چسپیاں : مطالعہ کرنا۔ قلمی دوستی۔
پتہ : معرفت نیو لائٹ ٹیلر ماسٹر بازار بجٹ گنج مردان

مسرت ممتاز ۔ کراچی
عمر : ۱۵ سال   تعلیم : نہم
دل چسپیاں : قلمی دوستی ۔ تصویریں جمع کرنا۔
پتہ : معرفت ایچ ایچ مشتاق احمد ۔ طوطارام بلڈنگ ۔ ٹاپ فلور راج مل روڈ آرام باغ کراچی

آفتاب احمد خاں ۔ لالہ موسیٰ
عمر : ۱۰ سال   تعلیم : چہارم
دل چسپیاں : کھیلنا اور رسالے پڑھنا۔
پتہ : معرفت حکیم جمیل احمد خاں ۔ مکان نمبر ۱۰ متصل گھی منڈی ۔ لالہ موسیٰ

گل حسن زاہد ۔ ٹنڈو محمد خاں
عمر : ۱۴ سال   تعلیم : پنجم
دل چسپیاں : لکھنا، پڑھنا اور قلمی دوستی کرنا۔
پتہ : معرفت محمد خاں سمون ہوٹل والا ۔ اناج منڈی چوک رکھنہ ۔ ٹنڈو محمد خاں

سید عبدالودود قادری ۔ شکاپور
عمر : ۱۸ سال   تعلیم : انٹر سائنس
دل چسپیاں : فوٹوگرافی ۔ ناول پڑھنا ۔ قلمی دوستی

پتہ : نثار فوٹو اسٹوڈیو۔ شکارپور۔

صہیب احمد صدیقی عامر۔ میانوالی

عمر : ۱۶ سال تعلیم : فرسٹ ائر

دل چسپیاں : اسلامی کتب اور بچوں کے رسالے دیکھنا۔

پتہ : معرفت P.W.I ۲/۸ کندیاں۔ ضلع میاں والی

ملک اختر محمود مہتاب۔ رحیم یار خاں

عمر : ۱۳ سال تعلیم : ہفتم

دل چسپیاں : فٹ بال کھیلنا۔ قلمی دوستی۔

پتہ : معرفت ظہور احمد پوسٹ مین۔ کوٹ سمابہ ضلع رحیم یار خاں

عبدالصمد خاں۔ سندھ

عمر : ۱۴ سال تعلیم : ہفتم

دل چسپیاں : فوٹو گرافی۔ قلمی دوستی

پتہ : معرفت عبدالقیوم حقانی نزد پولیس اسٹیشن ٹنڈو آدم

ہلال احمد چاٹگام۔ بہاول پور

عمر : ۱۰ سال تعلیم : قرآن پڑھنا

دل چسپیاں : قرآن شریف حفظ کرنا۔

پتہ : A/۱۴۹ جی، او کالونی۔ ماڈن ٹاؤن، بی۔ بہاول پور

محمد طلحہ تحسین قریشی۔ بہاول پور

عمر : ۱۲ سال تعلیم : ہشتم

دل چسپیاں : ٹکٹ جمع کرنا۔ قلمی دوستی کرنا۔

پتہ : A/۱۴۸۔ جی۔ او کالونی۔ ماڈن ٹاؤن بی۔ بہاول پور

محمد سلیم ۔ کیمبل پور

عمر : ۱۶ سال تعلیم : فرسٹ ائر

دل چسپیاں : مطالعہ۔ ہاکی کھیلنا۔

پتہ : مکان C.H.H.W/۳۹ چھوٹی ولیٹ کیمبل پور

فارم حلقۂ دوستی

نام .... عمر .... تعلیم ....

دل چسپیاں ....

پتہ ....

اِن الفاظ کے معنی کیا ہیں؟

اتالیق : استاد، تربیت دینے والا
افق : آسمان کا کنارہ، جہاں زمین اور آسمان ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔
انڈس : دریائے سندھ
بدھنا : مٹی کا لوٹا، جس میں ٹونٹی ہوتی ہے۔
پات : پتّا
پلڑہ : ترازو کا پلّا
پیچ و تاب کھانا : غصّہ
توہین : ذلّت
تھان : گھوڑا اور ہاتھی باندھنے کی جگہ
چتیاں : دھبّے، داغ
حویلی : مکان
خانقاہ : درویشوں کے رہنے کی جگہ
خرافات : بے ہودہ باتیں
خصلت : عادت
دامن : کسی چیز کا کنارا
دھندلکا : اندھیرا
راہب : عیسائیوں کا عالم
زار و قطار رونا : بہت رونا
زیر لب مسکراہٹ : آہستہ، چھپی ہوئی ہنسی

سحر : صبح
شان : قدر، مرتبہ
شکست : ہار
شکوہ : شکایت
طواف : کسی چیز کے گرد پھرنا
عتاب : ناراضگی
عظمت : بڑائی
غول : بھیڑ، گروہ
فضیلت : بڑائی
فیض : فائدہ، نفع، بھلائی
قفل : تالا
قمچی : پتلی چھڑی
کارستانی : ترکیب کا کام
گٹے : نشان جو رگڑنے سے پڑ جائیں
گھائل : زخمی
گھرکی : ڈانٹ ڈپٹ کرنا
ماہِ کامل : پورا چاند
ملال : رنج، افسوس
نہتّا : خالی ہاتھ
نہاں : چھپا ہوا، پوشیدہ

آرٹسٹوں اور انجینئروں کی پسندیدہ



بنانے والے
شاہ سنس لمیٹڈ
کراچی

گولڈ فش
آٹوکریٹ پنسل

سول ایجنٹس
شاہ ایجنسیز
کراچی چیمبرس
میکلوڈ روڈ
کراچی



دانتوں کی تکلیف کا
ایک عِلاج
مگر بہتر ہے
ہمدرد منجن
اِستعمال کریں
ہمدرد

اپریل ۱۹۶۵ء

رجسٹرڈ ایس نمبر ۱۹۰۳

چوتھا شمارہ

بارھویں جلد



ہمدرد نونہال

اس رسالے میں کیا ہے؟

قیمت: ایک رسالہ ۷۵ پیسے ——— سالانہ آٹھ رُپے